فَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر
اسرار احمد

جلد ۱۴ — نومبر و دسمبر ۱۹۶۷ء — شمارہ ۵، ۶

فہرست

★ تذکرہ و تبصرہ ———— اسرار احمد — ۳

★ اجتماع رحیم یار خاں ————

● تقریر مولانا عبدالغفار حسن ۱۷

★ تدبر قرآن ———— مولانا امین احسن اصلاحی

● تفسیر سورۂ نساء (۸) ۲۸

★ مطالعہ حدیث .. .. مولانا عبدالغفار حسن

● جہاد کی اعلیٰ قسم (۲) ۴۹

★ مقالات ————

● رمضان المبارک اور اس کی خصوصیات . . مولانا عبدالغفار حسن — ۶۵

● فکر مغرب کی اساس اور
● اس کا تاریخی پس منظر } پروفیسر یوسف سلیم چشتی — ۷۱

مولانا امین احسن اصلاحی

استقبال رمضان

اکتوبر کے آخری ہفتہ میں تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کا جو اجلاس سکھر میں ہوا اس میں دوسرے تنظیمی امور کے علاوہ یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ رمضان مبارک کے مہینہ کے لیے رفقا کو کوئی ایسا پروگرام دیا جائے جو ان کی ذاتی تربیت و اصلاح میں بھی ممدومعاون ہو اور اصلاح معاشرہ کے نقطہ نظر سے بھی مفید ہو۔ اس سلسلہ میں مختلف تجویزیں سامنے آئیں جن کو قلم بند کرکے میثاق میں شائع کر دینے کی خدمت راقم سطور کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ چند باتیں لکھی جاتی ہیں امید ہے تمام رفقا حتی الامکان ان کا اہتمام کریں گے۔

۱ — رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہونے سے پہلے پہلے اس مہینہ کے آداب و احکام اور اس کے مقاصد وفوائد سے متعلق ضروری معلومات مستند ذرائع سے حاصل کر لیجئے اور اس عزم کے ساتھ اس مہینہ کا آغاز کیجئے کہ حتی الامکان اس کے پورے حقوق ادا کریں گے۔ اپنے گردوپیش کے لوگوں کو بھی ان معلومات سے بہرہ مند کیجئے تاکہ جو لوگ اس مہینہ کی قدر و قیمت اور اس کے فوائد و مصالح سے کماحقہ آگاہ نہیں ہیں وہ بھی اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں۔

۲ — روزوں کے ساتھ ساتھ نماز با جماعت اور تراویح میں حاضری کا اہتمام کیجئے اور اپنے گردوپیش کے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیجئے۔

۳ — روزانہ کچھ وقت قرآن مجید کے تدبر میں صرف کیجئے اور اخلاق احادیث کے مستند مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ بالالتزام مطالعہ میں رکھیے۔ جو لوگ عربی سے آشنا نہ ہوں وہ کسی اچھی اردو تفسیر اور ریاض الصالحین کے اردو ترجمہ یا مولانا منظور نعمانی کی معارف الحدیث یا اسی نوعیت کی کسی اور کتاب سے استفادہ کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرتوں کا مطالعہ بھی اس زمرے میں شامل ہے۔

(بقیہ ٹائٹل کے صفحہ ۳ پر)

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا زرمبادلہ ختم ہوچکا ہے — آئندہ کے لئے

★ سالانہ زرمبادلہ مبلغ ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں — یا
★ بذریعہ خط ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کو آئندہ شمارہ سالانہ زرمبادلہ اور محصولڈاک کی مالیت کا وی پی ارسال کردیں۔

بصورت دیگر

★ ہم یہ گمان کریں گے کہ آپ آئندہ پرچے کی خریداری جاری نہیں رکھنا چاہتے، بنا بریں پرچہ کی ترسیل روک دی جائے گی!

- المنفلوطی : ایک صاحب طرز انشاء پرداز اور مصلح ادیب ... خان محمد ایم اے (عربی) ۸۱

★ حقائق و معارف ——————

- آخری منزل مراد .. .. .. اظہار احمد قریشی جوہر آباد ۹۱

★ افکار و آراء —————— ۹۵

- خذلان الٰہی اور اس کا علاج ... عتیق الرحمان سنبھلی مدیر الفرقان لکھنؤ
- علی گڑھ مرحوم ... مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید لکھنؤ
- جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہندوگردی کے نذر ... ابو محمد امام الدین رام نگری مدیر انوار الاسلام بنارس
- ایک نیا اصلاحی ادارہ ... مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید لکھنؤ

★ خطوط و نکات —————— ۹۹

- تاریخ اسلامی کا دور فتن اور مولانا اصلاحی (مولانا اصلاحی)
- فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اس کی فتنہ سامانی ... مولانا عبدالباری ندوی
- بریدِ فرنگ .... اظہار احمد ایم۔ اے (فلسفہ)

★ تقریظ و تنقید —————— م۔ م۔ م ۱۰۵

- قادیانیت .... مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی
- دیوان فراہی (عربی) .... مولانا حمیدالدین فراہیؒ

★ رسید کتب —————— ع۔ د ۱۱۲

- انتخاب رباعیات مولانا روم ... مرتبہ نجم الدین اصلاحی
- عزیزانِ ندوہ کے نام ... پروفیسر رشید احمد صدیقی

فہرست مضامین مطبوعہ میثاق از جولائی ۱۹۶۶ء تا دسمبر ۱۹۶۷ء ۱۱۳

کور کے اندرونی صفحات میں "استقبال رمضان" از مولانا امین احسن اصلاحی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

اس ماہ کے تذکرہ و تبصرہ میں اولاً وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو راقم الحروف نے یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کی رات کو جامعہ محمدیہ ملتان کے سالانہ اجلاس کی رات کی نشست میں کی تھی۔ اس لیے کہ اس میں جو گذارشات پیش کی گئی تھیں وہ میثاق کے بہت سے قارئین کے لیے واقعی "تذکرہ" کے حکم میں ہیں۔ تقریر نہ تو پہلے سے قلمبند تھی، نہ فوراً بعد ضبط تحریر میں آئی۔ اب حافظہ کی مدد سے مرتب کر کے بعض اضافوں اور آیات قرآنی کے حوالوں کے ساتھ درج کی جا رہی ہے۔

حمد و ثنا کے بعد آیہ کریمہ " وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ " کی تلاوت کی گئی اور عرض کیا گیا۔

بزرگو اور بھائیو!

حقیقت یہ ہے کہ میرا یہ مقام ہرگز نہ تھا کہ میں ایسے عظیم الشان دینی اجتماع سے خطاب کرتا۔ تاہم جب آپ حضرات کا حکم ہے تو میں کچھ معروضات پیش خدمت کرتا ہوں، اور اب جبکہ آپ حضرات سے ہم کلام ہونے کا ایک موقع مل ہی گیا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ ایسی بات آپ کے گوش گذار کروں جو حقیقتاً مفید ہو اور جس سے کم از کم ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے جو اَلۡقَی السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِیۡدٌ کی کیفیت کے ساتھ ان گذارشات کو سنیں اس لیے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات!

میں نے اپنی گذارشات کا عنوان قرآن حکیم کی اس آیت کو بنایا ہے کہ وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں! — یعنی میری آج کی گذارشات کا موضوع ہے۔ دعوتِ دین — اس موضوع کا انتخاب میں نے دو وجوہات کی بنا پر کیا ہے :-

ایک یہ کہ میں اور آپ جس امت کے افراد ہیں۔ اس کا مقصد وجود اور غرض تاسیس ہی 'دعوت الی اللہ' ہے اور دنیا میں ہماری عزت اور سربلندی ہی نہیں ہمارے وجود اور بقا کا انحصار

بھی اسی بات پر ہے کہ ہم اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہ ادا کریں۔ سورۂ بقرہ کے سترھویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی یہ آیت ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وسط اس لئے بنایا ہے کہ تم بنی نوعِ انسان پر گواہ ہو اور یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ ہوں۔ تحویلِ قبلہ کا حکم دراصل علامت (SYMBOL) تھی اس امر کی کہ اب متولیانِ مسجدِ اقصیٰ یعنی بنو اسرائیل سے ہدایتِ خداوندی کی امانت داری و علمبرداری کا منصب سلب کر لیا گیا اور متولیانِ مسجدِ حرام یعنی بنو اسمٰعیل اس منصب پر فائز کر دیئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کا اصل مرکز اور قلب (NUCLEUS) ہونے کی حیثیت بنو اسمٰعیل ہی کو حاصل ہے۔ ان ہی کی زبان خدا کی آخری کتاب کی حامل بنی اور ان ہی کے رسوم و رواج سے قطع و برید۔ اور حذف و اضافے کے ساتھ خدا کی آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا "اٰخَرِيْنَ" یعنی وہ دوسری اقوام جو بعد میں اس اُمّت میں شامل ہوتی چلی گئیں معنوی اعتبار سے یقیناً "مِنْهُمْ" یعنی ان ہی میں سے ہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا بڑا ہی فضل ہے جو ان پر ہوا۔ لیکن یہ شرف "اُمّیین" ہی کو حاصل ہوا کہ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اُن ہی میں — اور — ان ہی میں سے، ہوئی [1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اس امت کی وجہِ تشکیل اور غرض تاسیس سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ تم وہ بہترین امت ہو جسے بنی نوعِ انسان کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم حکم دیتے ہو نیکی کا، روکتے ہو بدی سے

---

[1] هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (جمعہ۔ رکوع ۱)

وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی میں کا پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیات اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت، حالانکہ اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے، صریح بھول میں، اور اٹھایا اس رسول کو ایک دوسرے لوگوں کے واسطے بھی جو ابھی ان میں نہیں ملے۔ مگر ابھی نہیں ملے ان میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔ یہ بڑائی اللہ کی ہے دیتا ہے جسے چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے

اور ایمان رکھتے ہو خدا پر — دنیا کی دوسری تمام اقوام و امم اپنے لیے جیتی ہیں اور ان کا مطمحِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کا بول بالا اور عظمت دوبالا ہو اور وہ آدم کی زیادہ سے زیادہ اولاد کو بس پڑے تو عسکری و سیاسی ورنہ کم از کم معاشی و تہذیبی تسلط کے چنگل میں گرفتار کر کے اپنے تابع رکھ سکیں لیکن اس امت کا جینا اس لیے ہے کہ دنیا میں اللہ کا نام رہے [1] اس کا کلمہ بلند ہو، حق کا بول بالا ہو۔ نیکیاں عام ہوں اور اچھائیاں پروان چڑھیں اور بدیاں ختم ہوں اور برائیوں کا استیصال ہو جائے۔ یعنی یہ امت دراصل دنیا میں خدا کی نمائندہ، حق اور خیر کا ذریعہ (INSTRUMENT) اور شر اور باطل کے استیصال کا ادارہ (INSTITUTION) ہے۔

جب تک یہ اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہی۔ اس کا اپنا بول بھی بالا رہا اور حق کے ساتھ یہ بھی سربلند رہی۔ لیکن جب اس نے اپنے مقصدِ وجود کو بھلا دیا اور یہ بھی بس دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئی تو اس پر بھی اسی طرح عتابِ خداوندی نازل ہوا جس طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ہوا تھا۔ اوّل اوّل معاملہ صرف وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ [2] تک محدود رہا اور عالمِ اسلام کی سیاست بنی اسرائیل سے چھین کر ترکوں اور سلجوقیوں کو عطا کر دی گئی۔ اس پر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو فتنۂ تاتار کی صورت میں قہرِ خداوندی کا "وعدِ اولیٰ" نازل ہوا اور بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ کا ہو بہو نقشہ کھنچ گیا۔ تاریخ حیران ہے کہ اہلِ ہند فتنۂ تاتار کا انتظار ہی کیوں کرتے رہ گئے اور کیوں ان کا رُخ تیر کی مانند سیدھا بغداد کی طرف رہا۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس امت کا مرکز بنو اسمٰعیل تھے اور ان کا قلب بغداد تھا اور اصل گوشمالی ان کی مطلوب تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں میں سے جو قومیں ابھریں۔ وہ بنی اسمٰعیل میں سے نہ تھیں "اٰخَرِيْنَ" میں سے تھیں یعنی ہند میں مغل اور ایشیائے کوچک میں ترک جو بالآخر خلافتِ اسلامی کے بھی وارث ہوئے اور اس طرح بنو اسمٰعیل کی مذہبی و دینی سیادت کا آخری امتیازی نشان بھی مٹ گیا اور ان کی حیثیت ترکوں کے محکوموں اور باج گذاروں سے زیادہ کچھ نہ رہی۔ یہ تو اس صدی کے واقعات ہیں کہ اس کے اوائل میں وہ ترکوں کی غلامی سے نکل کر پہلے یورپی تسلط کے تحت آئے اور پھر صدی کے وسط کے لگ بھگ آہستہ آہستہ اس سے بھی نجات پائی اور آزادی کا

---

[1] یخ ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے۔ اقبالؒ

[2] سورہ محمد۔ اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اسی مقام پہ فائز کر دے گا۔

سانس لیا۔ اس کے بعد کی ربع صدی اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ آزاد ہو کر بھی جب انھوں نے دین سے بے رخی اختیار کی اور تعیش و تنعّم کی زندگی کو اختیار کیا اور مغربی تہذیب کے ظاہر سے متاثر ہو کر عیاشی اور فکری و عملی آوارگی کو شعار بنایا۔ ملّتِ اسلامی کی بجائے نسلی و وطنی عصبیتوں کو ابھارا۔ شریعت کو پس پشت ڈالا اور مذہب کے نام لیواؤں پر مظالم ڈھائے تو بالآخر کم از کم بنی اسمٰعیل کی حد تک تو "وَعْدُ الْاٰخِرَةِ" ابھی آکر رہا اور اللہ نے اپنی ایک علی الاعلان (PROCLAIMED) مغضوب قوم کے ہاتھوں انہیں ایسی ذلّت آمیز شکست دی کہ رہے نام اللہ کا۔ [1]

حالیہ عرب اسرائیل جنگ سے ذلیل و خوار تو پوری ملّتِ اسلامی ہوئی اور یہ داغِ رسوائی لازماً سارے ہی مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ لیکن اس میں "وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ" کا مصداق بہرحال عرب ہی ہیں۔ دینی پستی اور مذہب سے بُعد یقیناً اس وقت پوری اُمّتِ مسلمہ ہی کا حال ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مصر، شام اور لبنان کی بدمستیاں دوسرے مسلمانوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ذلّت و رسوائی میں سے بھی سب سے بڑا حصہ انہی نے پایا۔ ویسے بھی جب عزت و فضیلت اور شرف میں یہ مقدم تھے تو منطقی طور پر ذلّت و رسوائی کا بھی حصۂ اولیٰ انہی کا ہونا چاہیئے!

قصہ طول کھینچ گیا۔ غرض صرف اس قدر کرنا تھا کہ اس امت کی غرض تاسیس دعوت الی اللہ ہے اور اس پر نہ صرف یہ کہ اس کی عزت و عظمت کا انحصار بلکہ وجود و بقا کا دار و مدار بھی ہے اور "اُمِّيّٖنَ" اور "اٰخَرِيْنَ" دونوں کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ "عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ" کی نوید جانفزا سے گرتے ہوئے حوصلوں کو از سرِ نو استوار اور ٹوٹتی ہوئی امیدوں کو نئے سرے سے قائم کریں اور "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"

[1] راقم الحروف نے جولائی ۱۹۶۷ء کے "میثاق" میں سیاہ حاشیے میں لکھا تھا "گذشتہ ماہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانانِ عرب کو جو ذلّت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے اپنے دلوں میں درد کی شدید ٹیسیں محسوس کیں، پھر تمام نام نہاد اقوام متحدہ نے اس معاملے میں سرد مہری ہی نہیں باقاعدہ اسرائیل نوازی کا جو رویہ اختیار کیا۔ اس سے کم از کم مسلمانانِ عرب کے لیے تو ایک بار "وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں کئی ہزار سال تک بنی اسرائیل مبتلا رہے ہیں۔"!

[2] وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا

ترجمہ: اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے ملک میں دو بار اور سرکشی کرو گے بہت۔ تو جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے تو پھیل گئے شہروں میں اور وہ وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔ پھر ہم نے

(باقی صفحہ آئندہ)

کی وعید سے لرزاں و ترساں ہو کر اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ [1] اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ پے در پے تنبیہات اسی لیے ہیں کہ ہم جان لیں کہ ہمارے لیے "فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ" کے سوا کوئی راہ نہیں ہے اور اپنی عظمت و سطوتِ پارینہ کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے وجود و بقا کی ضمانت کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل دعوت الی اللہ کے سوا موجود نہیں ہے۔!

دوسرا سبب آج کے اس اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کا یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی ہیں اور جن کا مسلک و مشرب ہی یہ ہے کہ جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا بس وہی کرنا چاہیئے۔ مبارک ہیں آپ لوگ اگر واقعتہً آپ کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے اتباع کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی دوسری سنّتیں تو یاد ہیں اور ان پر آپ عمل بھی پوری شدّت کے ساتھ کرتے ہیں، بلکہ ان کی وجہ سے آپ دوسروں سے جنگ و جدال سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی سنت، جس سے زیادہ

[1] جولائی ۱۹۶۷ء کے "میثاق" میں عرض کیا گیا تھا "اصحابِ علم اور اربابِ قلم نے بڑے بڑے مقالوں میں اس صورتِ حال کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا ہے اور اصلاحِ احوال کی تجاویز پیش کی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کا اصل سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے دین سے بُعد! اور علاج بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے تجدیدِ ایمان۔ اپنے نام لیواؤں اور اہلِ ایمان کے دعویداروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ دوسروں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ ان سے جہاں جلائی اور دینی و اخروی فوز و فلاح کے عظیم وعدے ہیں وہاں ان کی غلط روی پر پکڑ بھی سخت ہوتی ہے۔ کئی ہزار سال سے بنی اسرائیل اس قانونِ الٰہی کی گرفت میں آئے ہوئے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر آج اُمّتِ مسلمہ اس کی زد میں آگئی ——— کاش کہ مسلمانانِ عالم جان لیں کہ "وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ" کے سوا اس صورتِ حال سے خلاصی کی کوئی اور راہ موجود نہیں ہے۔!"

بقیہ حاشیہ نمبر ۲: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل آیات ۴ تا ۸)

ترجمہ: پھیر دی تمہاری باری ان پر اور قوت دی مال اور بیٹوں سے اور زیادہ کر دیا تمہارا لشکر۔ اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا اور اگر ... ... برائی کی تو اپنے لیے۔ پھر جب آیا وعدہ دوسرا (بھیجے اور بندے) کہ اداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جاویں مسجد میں جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جہاں غالب ہوں پوری خرابی۔ بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر اور اگر پھر وہی کرو گے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور کیا ہے ہم نے دوزخ کو کافروں کا قید خانہ!

مؤکد سنت اور کوئی نہیں جس پر آپ کا تواتر عمل ظاہر و باہر ہے، جس پر آپ اپنی بعثت کی پہلی ساعت سے حیاتِ دنیوی کی آخری گھڑی تک ہر لحظہ و ہر آن عمل پیرا رہے۔ اسے آپ نے نہ صرف یہ کہ عملاً ترک کر دیا ہے، بلکہ جعلاً بھی دبا دیا ہے۔ میری مراد "سنتِ دعوت" سے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤکد ترین سنت نہیں ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی بھر حضور کو دعوت و تبلیغ سے زیادہ کسی بات کا دھیان یا دھن رہی؟ اب اگر سنت نام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور طرزِ عمل کا تو خدارا سوچیے کہ آنحضور کی سب سے بڑی سنت کون سی ہے۔ "بَلِّغُوْا عَنِّیْ" کے تاکیدی حکم پر غور کیجیے کہ اس کو "وَلَوْ اٰیَۃً" کے ذریعے کس قدر عمومیت دے دی ہے۔ رفع یدین جس کے بارے میں آپ بہت جھگڑتے ہیں۔ کون ہے جو یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس پر آپ عمر بھر عمل پیرا رہے! آمین بالجہر کے بارے میں کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس پر آپ نے از اوّل تا آخر مداومت کی؟ برعکس اس کے "دعوت و تبلیغ" وہ سنتِ مؤکدہ ہے جس پر آپ ۲۳ سال کی پوری مدتِ نبوت کے دوران مسلسل عمل پیرا رہے ـــــ تو دعوت الی اللہ ایک طرف تو از روئے قرآن امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور فرضِ منصبی ہے اور دوسری طرف ہمارے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤکد ترین سنت ہے۔ لہٰذا اسی موضوع پر میں آپ سے چند باتیں کروں گا۔!

"دعوتِ دین" یا "دعوت الی اللہ" کوئی مفرد یا بسیط عمل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے متعدد پہلو اور بے شمار مراتب و مدارج ہیں۔ یہ ایک فرد کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) سے شروع ہو کر اس کے کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝) پھر قوم (يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۝) اور بالآخر پوری نوعِ انسانی (لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچتی ہے۔ اس کی ابتدا محض خبردار کرنے اور "ڈر سنا دینے" (يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝) سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات کی کبریائی کا اعلان و اظہار ہو (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝)۔ حسبِ استعداد و مذاق مخاطبین اسے بلند پایہ علمی و عقلی استدلال کے ساتھ بھی پیش کیا جانا چاہیے (اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ) اور مؤثر و دلنشیں وعظ و نصیحت (وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ) کے ذریعے بھی، پھر کٹ حجتوں اور ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلے میں بحث و جدال کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے (وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ

حدیث نبوی۔ میری جانب سے پہنچاؤ چاہے ایک ہی آیت۔!

هِيَ اَحْسَنُ ۝) اور وقت آنے پر جہاد و قتال بھی اسی دعوت الی اللہ کی بلند ترین منازل قرار پاتے ہیں۔ (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۝) تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو، اسی کا حکم چلے اور لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں (لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۝)

آج کی اس گفتگو میں میں دعوت الی اللہ کے ان بلند تر مراتب سے بحث نہیں کرنا چاہتا جن کے لیے اجتماعی جد و جہد لازمی ہے یعنی ایک تو بنی نوعِ انسان پر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جانب سے اتمامِ حجت کا وہ فریضہ میری آج کی گفتگو کے دائرے سے خارج ہے جو آپ کی امت پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتا ہے۔ اور دوسرے خود اس امت کی اجتماعی اصلاح کا وہ عظیم کام بھی میری آج کی گفتگو کا براہ راست موضوع نہیں ہے جو بجائے خود ایک منظم اجتماعی جد و جہد کا متقاضی ہے ـــــ اس کے برعکس آج میں "دعوت الی اللہ" کی ان ابتدائی اور بنیادی منزلوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن تک ہر مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

اس سے پہلے میں اس استہزا کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے میں تبلیغ کے مقدس اور عظیم الشان فریضے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہر مذہبی فرقے نے "مبلغین" کی ایک مستقل سروس جاری کی ہوئی ہے اور اس کے تحت تنخواہ دار مبلغ بعض اختلافی مسائل پر مناظرانہ انداز کی تقریریں دیہات و قصبات میں کرتے پھرتے ہیں۔ جس سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ان کے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں پر وقتی طور پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ واقعۃً ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارا ہی مسلک صحیح تر ہے! ـــــ ایسے مبلغین کی اکثریت کو تو اس کی سرے سے جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے سامعین کو براہِ راست خطاب کر کے یہ کہہ سکیں کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں انہیں دور کرو، سودی کاروبار نہ کرو، غلط حسابات نہ رکھو، رشوت نہ لو، اسراف نہ کرو۔ بعض اگر برائے بیت ایسی کوئی بات کہہ بھی دیں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لیے جس اجتماع میں وہ تقریر کر رہے ہیں، اس کا اہتمام ان تمام غلط کاموں کی آمدنی سے ہوتا ہے! سامعین کی اکثریت تھوڑی دیر کے

ے واضح رہے کہ از روئے قرآن علماء و صلحاء امت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے جس کی جانب اس آیت کریمہ میں اشارہ ہوا: لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۝ (کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے؟)

لیے اپنے مقررین کی اس حق گوئی سے بھی لذت اندوز ہولیتی ہے، ـــ بے میاں حضرات اور چوہدری صاحبان تو وہ زیرِ لب مسکرا کر اس وقت تو ایک خاموش مگر تلخ طنز پر اکتفا کر لیتے ہیں مگر بعد میں اپنی نجی گفتگوؤں میں اپنے مذہبی پیشواؤں کی گھریلو نجی خامیوں اور کوتاہیوں کا اہانت آمیز تذکرہ کر کے بدلہ چکا لیتے ہیں!

ـــ اور اس پورے سلسلے کا نام ہے تبلیغ دین!

حضرات! میں پورے سوز اور درد کے ساتھ آپ کو یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ متواتر و مؤکد سنت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر نہیں ہے؟ اور کیا اس طرح نادانستہ طور پر ہم خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ "منبرِ رسول" پر کھڑے ہونے والوں کی ہمارے اس معاشرے میں جو قدر و منزلت دعزت و وقعت ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا اصل سبب خود وہ ہیں یا دوسرے، اس سے کیا بالواسطہ خود اس محترم ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر نہیں ہوتی جس سے یہ منبر منسوب ہے؟ خدا کے لیے اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ تنخواہ پہ کام کرنا حرام نہیں لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ معاوضے پر کام کرنے والا مدرّس و معلّم ہو سکتا ہے داعی و مبلّغ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس راہ کی تو سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر طرح کے مفادات و اغراض سے بالکل پاک ہو کر خالص نُصح و خیر خواہی کے جذبے سے اور اس اعلان کے ساتھ کام کیا جائے کہ وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ [1]

آپ حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بہت مرتبہ سنی ہو گی کہ جس نے میری کسی ایسی ایک سنت کو زندہ کیا جس پر عمل متروک ہو چکا ہو تو اس کو سو شہیدوں کا اجر و ثواب ملے گا۔ میں آج آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "سنتِ دعوت" کو زندہ کریں اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ میں سے ہر شخص یہ فیصلہ کرے کہ آج سے میں "دین کا داعی" "اللہ کی طرف پکارنے والا"، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ دعوت کا ادنیٰ متبع ہوں۔!

اس بات کو بالکل دل سے نکال دیں کہ دین کی دعوت کے لیے دین کے کسی لمبے چوڑے علم کی

[1] ترجمہ: میں تم سے اس دعوت پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے!

ضرورت ہے، آج "علمِ دین" "جن معلومات" کا نام ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اکثر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آپ میں سے اکثر سے کم حاصل تھیں۔ انہیں جو علم بتمام و کمال حاصل تھا وہ "علمِ ایمان" تھا جیسا کہ ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ تَعَلَّمْنَا الْاِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ "ہم نے ایمان پہلے سیکھا، قرآن بعد میں!"

منطقی طور پر بھی "دعوت الی اللہ" کا اصل لازمہ "ایمان باللہ" ہی کو ہونا چاہیے، چنانچہ جو آیت میں نے سنائی تھی اس سے متصلاً قبل ایمان باللہ کی بلند ترین منزل یعنی ربوبیتِ خداوندی پر دل کے جم اور ٹھک جانے اور اس پر استقامت حاصل ہونے ہی کا تذکرہ ہے کہ "اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ...... الخ" دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خدا کی ربوبیت پر پوری طرح مطمئن اور اس پر مضبوطی سے قائم ہوں،

"دعوت الی اللہ" کا دوسرا لازمہ یہ ہے کہ داعی کی عملی زندگی میں ایمان باللہ کے اثرات محسوس و مشہود ہوں اور وہ عملِ صالح کا ایک حسین نمونہ ہو، چنانچہ اس آیت میں بھی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ کے فوراً بعد وَعَمِلَ صَالِحًا کا تذکرہ ہے، اس لیے کہ یہ دعوت کے مؤثر ہونے کی شرطِ لازم ہے! اس کے بغیر تعلیم و تدریس ہو سکتی ہے، اعلیٰ سطح کا علمی کام بھی کیا جا سکتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان چیزوں کا اپنا ایک مقام اور ان کی اپنی ایک افادیت ہے لیکن "دعوت" مؤثر صرف وہی ہو سکتی ہے جس کا شاہد "عملِ صالح" ہو ـــ حقیقت یہ ہے کہ "عملِ صالح" ہی وہ مشکل گھاٹی [1] ہے جس سے جی چرا کر ہم لوگوں نے یہ "تقسیمِ کار" کی ہے کہ کچھ لوگ اس کی قید سے آزاد ہو کر حلال و حرام سب ذرائع سے دولت کما کر کچھ دوسرے لوگوں کو پالیں، جو دین کی تبلیغ کا کام کریں ـــ ذہانت کا تو یہ یقیناً ایک شاہکار ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین کے خلاف اس "شریفانہ معاہدے" سے بڑی سازش شاید کوئی اور نہ ہو! ـــ!!

یہ آیۂ کریمہ دعوت کے مطلوبہ عمل کے ایک اور پہلو کو بھی واضح کر رہی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اللہ اور اس کے دین کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ کسی خاص فرد، یا گروہ، یا جماعت یا فرقے یا مسلک و مشرب کی طرف۔ دعوت کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اللہ کو پہچانیں

[1] فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ..... الخ (سورۃ بلد)

اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس پر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یقین رکھیں، اسی کی اطاعت و بندگی کو اپنے اوپر لازم کریں اور اسی کی رضا جوئی کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنائیں اور اس کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے کو اختیار کریں۔ اس بات کو اس آیۂ کریمہ میں دو طرح واضح فرمایا گیا: ایک "مِمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ" کے الفاظ سے اشارہ کر دیا گیا کہ دعوت اللہ کی طرف ہو کسی خاص فرد یا جماعت کی طرف نہ ہو۔ اور دوسرے "وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں مزید وضاحت کر دی گئی کہ داعی خود بھی صرف مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور کسی خاص گروہ یا فرقے کی جانب اپنے آپ کو منسوب نہ کرے اور اس کی دعوت بھی صرف "اسلام" کی طرف ہو نہ کہ کسی خاص مسلک و مشرب کی طرف۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک تو دین بس اسلام ہی ہے! اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۝

قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ مختصر ترین الفاظ میں وسیع ترین مفہوم کو بیان کر دیتا ہے۔ یہاں "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں ایک اور فتنے کی بیخ کنی بھی کر دی گئی ہے جس میں داعی کے مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہوتا ہے۔ یعنی مقام دعوت پر فائز ہونے کا تکبر، غرور اور گھمنڈ ——— جس سے ایک طرف داعی خود راندۂ درگاہِ حق ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی دعوت کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ میں ایک داعیٔ حق کے قلبی تذلل و تواضع کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں بھی بس ایک مسلمان ہی ہوں اور عام مسلمانوں سے کسی طرح بھی افضل یا اعلیٰ نہیں ہوں! ——— اس طرح "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" سے بیک وقت ایسے دو فتنوں کا سدِباب کر دیا گیا جن میں عموماً اصحابِ دعوت و عزیمت کے مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، یعنی ایک یہ کہ ان کی دعوت امت میں ایک نئے فرقے کی پیدائش کا سبب بن سکتی ہے جس سے افتراق و انتشار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا سدِباب اس سے ہو جاتا ہے کہ داعی اور اس کے ساتھی یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھیں کہ ہم بھی مسلمانوں ہی میں سے ہیں اور امتِ مسلمہ ہی کا ایک جزو ہیں، کوئی علیحدہ چیز نہیں!

اور دوسرے یہ کہ داعی کی اپنی شخصیت ایک نیا بت بن جائے جس کی پرستش شروع ہو جائے۔ اس فتنے کی ابتدا اصل میں داعی کی اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ یعنی پہلے خود اس کے اپنے دل و دماغ میں یہ خناس پیدا ہوتا ہے کہ میں "چیزے دگر" ہوں۔ داعی کے قلب کا یہ احساس اس کے قریبی ساتھیوں پر منعکس ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ "پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند" کے مصداق داعی کی شخصیت لات و منات اور عزّیٰ و ہبل کی فہرست میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا سدِباب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ داعی کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت عیاں رہے کہ "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں بھی بس ایک عام مسلمان ہوں اور اگر اللہ نے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کے مصداق حالتِ اسلام ہی میں اٹھا لے تو بس یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے!

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا" کے الفاظ پر بھی غور فرما لیجیے! ان الفاظ میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ہر صاحبِ صلاحیت آدمی کسی نہ کسی بات کی دعوت دیتا ہی ہے، کوئی خاندان یا برادری کے مفادات کی پکار لگاتا ہے تو کوئی ملک و قوم کی عظمت کا راگ الاپتا ہے، کوئی جمہوریت کے قیام کی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو کوئی اشتراکیت کے نفاذ کا داعی بنتا ہے ——— لیکن ان سب سے بہت بلند، اعلیٰ اور ارفع دعوت اس کی ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف پکارتا اور اس کے دین کی دعوت دیتا ہے ——— حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے انسان کے لیے اس مرتبے سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں کہ وہ "دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ" اور "سِرَاجًا مُّنِيْرًا" صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ نور کر کے خود بھی ہدایت کا ایک چھوٹا سا چراغ بن جائے ——— ! وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ "پس چاہیے کہ اسی کی حرص کریں حرص کرنے والے!"

تقریر کا دوسرا حصہ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے استشہاد کر کے "دعوت الی اللہ" کی ابتدائی منزلوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، انشاء اللہ، آئندہ ماہ کے "تذکرہ و تبصرہ" میں درج کیا جائے گا۔

خدا کے فضل و کرم سے آج راقم الحروف قارئین 'میثاق' کو یہ خوشخبری سنانے کے قابل ہو گیا ہے کہ "تدبر قرآن" کی جلد اوّل طباعت و جلد بندی کے جملہ مراحل طے کر چکی ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ!! راقم الحروف تو جیسے بھی اس سے بن پڑا دیر یا سویر اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ اب یہ اس کے قدر دانوں کا کام ہے کہ اس کی 'اشاعت' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ دوسری جلد کی طباعت کا مرحلہ شروع ہو سکے!

یہ جلد اپنی اشاعت کے پہلے اعلان کے پورے ڈیڑھ سال بعد طبع ہو کر تیار ہوئی۔ اس دوران میں بارہا ان سطور کے راقم کو اس کے قدر دانوں سے تاخیر و تعویق کے لیے معذرت کرنی پڑی۔ لیکن آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے یہ عرصہ کچھ ایسا زیادہ نہیں ——— جبکہ طباعت و اشاعت کا کوئی باقاعدہ ادارہ موجود نہ تھا اور تنہا ایک فرد نے اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھا لیا تھا ——— ہمارا ایمان ہے کہ نیکی کے ارادے کی توفیق بھی منجانب اللہ ہی ہوتی ہے اور اس کی تکمیل کا دارومدار بھی اسی کی تائید و نصرت پر ہے ——— میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے دل میں 'تدبر قرآن' کی اشاعت کا ارادہ پیدا فرمایا (وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ ۝) اور پھر اس کی کتابت و طباعت اور جلد بندی کے جملہ مراحل کو بحسن و خوبی پورا کرایا ——— پرانی کہاوت ہے کہ دیر یا سویر کا معاملہ تو کسی کام کے انجام پا جانے کے بعد خارج از بحث ہو جاتا ہے، لیکن یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتا ہے کہ "کام ہوا کیسا؟" کسی کام کی تکمیل کے بعد "فی کم فرغت" کی بجائے اصل سوال "ما صنعت؟" کا ہوتا ہے۔ تو اس پر میں اللہ کا جتنا شکر بجا لاؤں کم ہے کہ کتاب کی اشاعت میں دیر چاہے ہو گئی اس کی کتابت، طباعت اور جلد بندی سب کی سب نہایت عمدہ ہوئیں ——— مولانا امین احسن اصلاحی کے لیے کتاب کی تصنیف بھی شاید اتنی بڑی بات نہ ہو جتنی میرے لیے اس کی طباعت و اشاعت میں اسی پر خوش ہوں کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

زیر نظر شمارے کے ساتھ راقم الحروف کی زیر ادارت 'میثاق' کا ڈیڑھ سال مکمل ہو گیا ہے! واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے ورنہ کہاں ان سطور کا راقم اور کہاں 'میثاق' کی ادارت! آج سے پورے دو سال قبل اس کا گمان بھی راقم الحروف کو نہ تھا۔ اپنی حکمتیں وہی بہتر جانتا ہے۔ اب سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ منٹگمری میں میڈیکل پریکٹس کرتے ہوئے کوئی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کبھی لاہور نقل مکانی ہو سکے گی۔ پھر اللہ کی بے نیازیاں! پہلے کراچی بھیجا اور پھر ایک دم لاہور ——— 'کتاب' کی اشاعت تو کچھ اپنے ارادے سے ہوئی کچھ بعض احباب خصوصاً مولوی محی الدین صاحب سلفی کے اصرار پر پھر جو سلسلہ چلا وہ قارئین 'میثاق' کے سامنے ہی ہے!! ——— بہرحال اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں اگر کوئی خیر بن آیا تو وہ اللہ کی توفیق سے ہوا اور اسی سے اس کی جزا کی امید ہے اور اگر کوئی شر ہوا تو میرے شرورِ نفس کی بنا پر ہوا اور اس پر میں اللہ تعالیٰ سے عفو و مغفرت کی درخواست کرتا ہوں!

آئندہ بعض 'معنوی' اور بعض 'صوری' تبدیلیاں 'میثاق' میں پیشِ نظر ہیں۔ معنوی تبدیلیوں کا تذکرہ پیشگی نہیں کرتا۔ قارئین خود محسوس فرما لیں گے، صوری تبدیلیاں حسب ذیل ہیں:

ا۔ پرچے کی ضخامت بڑھا کر ۶۴ صفحات کر دی جائے گی۔

ب۔ جلد مکمل ایک سال کی ہو گی اور صفحات کا اندراج ہر اشاعت کا علیحدہ بھی ہو گا اور پوری جلد کا مسلسل بھی۔

ج۔ سنجیدہ و معیاری اشتہارات، خصوصاً علمی کتابوں، کے قبول کئے جائیں گے،

د۔ سالانہ زرِ مبادلہ کے خاتمے کی اطلاع پر اگر نہ رقم بذریعہ منی آرڈر آئی، نہ ہی وی۔ پی ارسال کرنے کی فرمائش ہوئی تو پرچے کی ترسیل روک دی جائے گی وی۔ پی ارسال نہیں ہو گا!

ے بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند　　سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند!

---

۱ "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ"

ماہنامہ **میثاق** لاہور

کے

قواعد وضوابط

- میثاق، ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہو جانی چاہیئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جا سکے گا۔

◎

- ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے
- پرچہ صرف بذریعہ وی۔پی ارسال ہو گا۔
- کمیشن ۲۵ فیصد • محصول ڈاک بذمہ میثاق۔
- بڑے شہروں میں سول ایجنسی کی شرائط بذریعہ خط و کتابت طے کی جائیں۔

◎

ہندوستانی خریدار

مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقوم ارسال کر کے ہمیں مطلع فرما دیں:

۱۔ دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

۲۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ

قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

سالانہ زر مبادلہ .. .. .. ساڑھے سات روپے

مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک .. .. پندرہ روپے

◎

(منیجر میثاق)

مولانا عبد الغفار حسن

ایک نئی دینی جماعت

کی ضرورت اور اس کی خصوصیات

> ذیل میں مولانا عبد الغفار حسن، استاذ حدیث مدینہ یونیورسٹی و رکن مجلس مشاورت، تنظیم اسلامی پاکستان کی وہ تقریر درج کی جا رہی ہے جو موصوف نے ۱۰ ستمبر ۶۷ء کو اجتماع رحیم یار خاں میں ارشاد فرمائی تھی — اسے راقم الحروف نے ٹیپ شدہ تقریر کی مدد سے مرتب کیا ہے، اور افسوس ہے کہ اسے مولانا کی نظرثانی کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے۔
>
> :اسرار احمد:

حمد و ثنا کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درس قرآن، پھر قرارداد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں، تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اولاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے! بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟۔

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس سے کام میں عظیم برکت پیدا ہوتی ہے ــــ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں، کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہے، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے۔ کسی کو غور و فکر اور تدبر و تفکر کی، ــــ اسی طرح کسی کو علوم دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلومات دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے، کسی کو فہم قرآن کے بحر عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علوم حدیث کی وسعتوں میں پیراکی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے روشناس کیا ہے۔ مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے پھر دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک[1] یہ کہ اس سے جماعتی و گروہی عصبیت پھر تعصب اور بالآخر تحزّب و تفرّق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے[2] یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے[3] یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور اس سے بعض اوقات انتہائی کریہہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اولین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو برائی کا ہو سکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ہے لیکن وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا شر ان کی منفعت سے زیادہ ہے۔ اس

سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیئے۔

"شخصیت پرستی" کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات و نظریات و تصورات اور اسی کے فہم و فکر کو اس اجتماعیت میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتدا سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور مسلکِ "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہیں تو انشاء اللہ اس لعنت کا سدِّباب ہو جائے گا۔

"تحزّب اور تفرّق" سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لئے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں۔ اور اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصوّر کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہو، نہ اپنے "چیزے دگر" ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر و برتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیئے کہ تحزّب اور تفرّق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں، ظاہر بات ہے کہ جو درس گاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے، نتیجۃً اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین و متوسلین میں گروہی و حزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لئے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے امت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر غور میں نے کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، لوگوں میں کچھ "چیزے دگر" ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" کی

قرآنی ہدایت کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعات اور ربط و ضبط اور رشتوں ناتوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رجحان نہ پیدا ہو ——— ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے 'داخلی انتشار' کا ہے۔ تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعتہً اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحش پیدا ہوتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پر اجتماعی جد و جہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالم واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے، ——— لَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ——— تحریکیں اٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خودکشی کر لیتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں ——— لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے اختلافات کے حل کے لئے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے ——— یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درسگاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درسگاہ قائم نہ کی جائے اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام کی نفی نہیں کرتا اور جس طرح ایک نئے دارالعلوم کے مؤسسین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درسگاہوں کے بارے میں بہت بُری ہے اسی طرح ایک نئی دینی جماعت کے مؤسسین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بُری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں ہمارے

نقطۂ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلی اختلاف ہے یعنی ان کے طریقِ کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— دوسری جماعتیں ایسی ہیں جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں ——— ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے۔ لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے، ہر جماعت کے مؤسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جا سکتا۔ اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ محض آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں۔ لہٰذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنے صواب دید کے مطابق کام کریں ——— اب اگر تو خلوص اور للٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے۔ اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے تہی دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہو سکتی ———!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا۔ جس کے قیام کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور اس کی توضیحات میں بھی، پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں، تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے۔

پہلی خصوصیت ہماری پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف

نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے۔ اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ! ——— دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دار جزا۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے جملہ تقاضوں کو اُخروی جزا ہی کے لئے پورا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اور اس کے لئے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظامِ دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر "نصب العین" کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں ہے!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی یہ ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی نہ کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہوگی نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہوگی نہ حریف۔ اس میں حُبّ اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے۔ اور یہ "کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ شُہَدَاءَ لِلّٰہِ" کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی کرے گی، اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بناء پر عدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے (لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا ۫ ہُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫) ——— چنانچہ ہمارے لئے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا ——— مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں، اور انسان اپنی جماعت کے بڑے سے بڑے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر اسلامی تنظیم انشاء اللہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس کے پیدا شدہ تنازع للبقا کی بجائے وحدتِ الٰہ و آدم اور توافق یا تعاون للبقاء کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلاف مذاہب و مسالک کے متعلق

ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق علیہ بھی۔ دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ اور تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم انشاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز و محور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔ اس لئے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لئے بھی کہ موجودہ دور کے فتنوں کی زد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے۔ اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمتِ تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے، اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری، ان معاملات میں مصلحت کی بنا پہ رواداری ممکن نہیں ہے ——— البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے، ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلۂ خیال ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ ہم اپنی اس اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخدلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں "اَلْاَہَمُّ فَالْاَہَم" کا اصول پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ اور تبلیغ و دعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی، ——— یہ تمام معاملات احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی، جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے، یہ ہوگی کہ اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائض دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اتمامِ حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے، ہماری یہ اسلامی تنظیم انشاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوشاں ہوگی۔

پیشِ نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری

قرارداد میں صراحتہً یا دلالتہً مذکور ہیں، اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و اوراد کے معاملے میں یہ اصول متعین کر لینا چاہیئے کہ ہم اوراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو خدا کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہوں۔ اس کا اوّلین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول کے ساتھ جڑے رہیں گے، اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون و ماثور ادعیہ و اذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ آجکل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہیئے، منفی کام نہیں کرنا چاہیئے تو یہ میری ذاتی رائے میں از روئے دین درست نہیں ہے، ——— دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمت تبلیغ کو پیش نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر، اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرفِ نظر کر کے صرف 'مثبت' باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اور دینی غیرت و حمیّت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین و شرع امور پر برملا تنقید کی جائے چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام۔ اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ آجکل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا۔ جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین و اُمراء کو حاصل تھی۔ اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی "افضل الجہاد" کے حکم میں داخل ہو گئی ہے!

تیسرے یہ کہ جاہلیت قدیم اور جاہلیت جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے، یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیت قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیت جدیدہ کے استیصال کی قدرت و طاقت رکھیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں محاذ پیش نظر رہیں اور کسی سے صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیش نظر تنظیم اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہیئے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دارومدار ہو۔ بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے، جو بات کہی جائے وہ صرف عقل ہی نہ ہو بلکہ دل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہل عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی۔ اور دعوت خود اہل عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہیئے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیش نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل و عقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے ——— اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیش نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہیئے کہ اس میں زہد خشک اور تفریح کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو۔ اور نہ تو "عبوسًا قمطريرًا" کا نقشہ پیدا ہو جائے نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح 'رہبانیت' اور 'تنعّم' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترکِ لذائذ کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتّع ہونے کو برا سمجھنا بھی دین کی روح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرارداد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آ چکی ہے

کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبّدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہوجاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رونما ہوجاتی ہیں۔ پیشِ نظر تنظیم میں انشاء اللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح تشخیص کرسکیں۔ بصورت دیگر یہ ہوسکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جد و جہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی نگاہِ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کرلیا تھا کہ منعِ زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر "فروعی" معاملات کی تہہ میں اصل مرض کونسا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز کی نگاہِ دوررس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح صحیح اندازہ کرلیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجدّدین اپنے اپنے دور کے فتنوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرکے ان کے سدِّباب کی سعی کرتے رہے۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین۔ اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالےٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی بندھی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور و فکر اور تفکر و تدبر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدِّباب کی صحیح راہ کونسی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرکے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالےٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضہ، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد

سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان و سکون حاصل ہوگا ——— اور مشکل اس اعتبار سے کہ بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جد و جہد کا کوئی خصوصی نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمالِ صبر و استقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج و ثمرات سے بالکل بے نیاز ہوکر کام کئے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا کہ "اے علی، اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو ہونا چاہیئے۔ اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالےٰ ایک فردِ بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اُسے چاہیئے کہ اس بات کو واقعتہً ایک دولت بے بہا اور نعمت غیر مترقبہ تصور کرے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب و نظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہوجائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں مَیں اپنے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالےٰ سے ہدایت و استقامت اور عفو و مغفرت کی دعا کرتا ہوں ——— وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

★ ہر اتوار کو بعد نماز ظہر ——— (دو بجے بعد دوپہر تا چار بجے شام)

★ بمکان:- ڈاکٹر اسرار احمد ایم بی بی ایس

امرت روڈ (نزد سراج بلڈنگ) کرشن نگر۔ لاہور

نوٹ:- (۱) قرآن حکیم کا انتیسواں پارہ اور حدیث میں ریاض الصالحین شروع ہے زیرِ درس ہیں۔

(۲) رمضان المبارک کے دوران بھی درس جاری رہے گا!

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سُورہ نساء

(۸)

۲۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۔ ۸۶-۸۷

تحیۃ

"حیّاہ تحیۃ" کے اصل معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اسی سے دعائیہ کلمہ حیاک اللہ ہے جس کے معنی ہیں، اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ سلام اور اس مفہوم کے دوسرے دعائیہ کلمات بھی چونکہ کم و بیش اپنے اندر یہی یا اسی سے ملتے جلتے مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں اس وجہ سے لفظ کے عام مفہوم میں وہ سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں سلام کی اہمیت

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت، ابتدائی تعارف، اظہار محبت و اعتماد، نشان اخوت و مودت اور علامت وحدت فکر و عقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی اتصال و ارتباط کے نقطہ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد، خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بیگانگی ہو، آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطے سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ اور فقرے معروف تھے۔ مثلاً 'حیاک اللہ' اہلاً و سہلاً و مرحبا وغیرہ۔ سلام کا لفظ بھی معروف تھا جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آلائش تھی باقی تمام

پاکیزہ کلمات باقی رہے البتہ 'السلام علیکم' کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامتِ فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کے سامنے السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا من و تو کا فرق اٹھ گیا اور دونوں دو قالب یک جان ہو گئے اور اگر جواب نہ دیا تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے تھے کہ اس نے اس کے سلام کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کے اسلام کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

کلمۂ تحیت کی اس اہمیت کی وجہ سے اس موقع پر جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، منافقین سے اعراض کی ہدایت ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ جب کوئی شخص تمہیں سلام و تحیت سے مخاطب کرے تو اس کا اسلامی و معاشرتی حق یہ ہے کہ اس کے سلام و تحیت کا اس کو جواب دو۔ اس کا اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ پر جواب دو، اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ زیادہ پرجوش لوگوں کی طرف سے اس مرحلے میں منافقین کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کی نوبت نہ آنے پائے۔ خاص طور پر اس کا یہ پہلو بہت نازک تھا کہ بعض حالات میں اس کی زد میں وہ لوگ بھی آ سکتے تھے جو فی الحقیقت تو منافق نہ ہوتے لیکن زیادہ حساس لوگوں کو کسی سبب سے ان پر منافقت کا شبہ ہو جاتا۔

یہ پیچیدگی تو ان منافقین کے معاملے میں تھی جو دار الاسلام میں تھے۔ ان سے زیادہ پیچیدہ معاملہ ان مسلمانوں کا تھا جو دار الحرب میں تھے۔ ان مسلمانوں کے اندر بھی جیسا کہ آگے آرہا ہے منافق اور مخلص دونوں ہی قسم کے تھے۔ قرآن نے اگرچہ ان کے درمیان امتیاز کے لیے نہایت واضح کسوٹیاں مقرر کر دیں تاہم اس کا اندیشہ باقی رہتا تھا کہ کوئی مخلص مسلمان مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آجائے، اس لیے مسلمانوں کو آگے آیت ۹۴ میں یہ ہدایت کی گئی کہ جس علاقے پر حملہ کرو اس کے مسلمانوں کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لو۔ اگر کوئی تمہیں سلام کرے اور اس طرح تمہارے ساتھ اپنی دینی اخوت و مودت کا اظہار کرے تو بے تحقیق کیے اس کے مسلمان ہونے

سے انکار نہ کرو۔

الغرض یہ سلام اور جواب سلام کا معاملہ کوئی رسمی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اسلامی معاشرہ میں یہ وصل و فصل کی بنیاد رہا اس وجہ سے قرآن نے اہمیت کے ساتھ اس کو بیان فرمایا اور تنبیہ فرمائی کہ خدا ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے اور قیامت کے دن سب کو اپنے اعمال و اقوال کا جواب دہی کرنی ہے۔

لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ کے بعد اِلٰی کا صلہ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے، دھکیلنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔

فَمَا لَکُمۡ فِی الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِئَتَیۡنِ وَ اللّٰہُ اَرۡکَسَہُمۡ بِمَا کَسَبُوۡا ؕ اَتُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَہۡدُوۡا مَنۡ اَضَلَّ اللّٰہُ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ سَبِیۡلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ کَمَا کَفَرُوۡا فَتَکُوۡنُوۡنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡہُمۡ اَوۡلِیَآءَ حَتّٰی یُہَاجِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَخُذُوۡہُمۡ وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡہُمۡ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡہُمۡ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا ۔ ۸۸ - ۸۹

فِئَتَیۡنِ ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مثلاً کہیں گے مَالَکَ قَائِمًا۔

رَکَسَ الشَّیۡءَ کے معنی ہیں چیز کو الٹ دیا، اوندھا کر دیا۔ اَرۡکَسَہٗ اس کو اوندھا کر دیا۔ اَرۡکَسَ الشَّیۡءَ چیز کو اس کی سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

اب یہ ذکر ہو رہا ہے ان منافقین کا جو بلا کسی عذر معقول کے، محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد و املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں اور مدینہ میں دار الاسلام قائم ہو جانے کے باوجود، اب تک بدستور دار الکفر یا دار الحرب ہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس چونکہ کوئی عذر شرعی موجود نہیں تھا اس وجہ سے ان کا نفاق واضح تھا لیکن مسلمانوں میں سے کچھ لوگ جو ان کے ساتھ رشتہ داریاں اور قرابتیں یا خاندانی اور قبائلی نسبتیں رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بہت نرم تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کو نہ صرف ان کے حال پر چھوڑا جائے، بلکہ ان کے ساتھ ربط ضبط بھی قائم رکھا جائے، آہستہ آہستہ یہ لوگ سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔ قرآن نے اس خیال کے لوگوں کو تنبیہ کی کہ جو لوگ اس طرز پر سوچ رہے ہیں، غلط سوچ

رہے ہیں۔ اب یہ منافقین اسلام کی طرف بڑھنے والے نہیں ہیں، انھوں نے اسلام کی طرف جو قدم بڑھایا تھا، دنیا کی محبت میں انھوں نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو پھر پیچھے ہٹا لیا جس کی سزا میں اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو پھر اسی کفر میں دھکیل دیا جس میں وہ پہلے تھے۔ جو لوگ خدا کے قانون اور اس کی سنت کی زد میں آ چکے ہوں وہ اب راہ راست پر نہیں آ سکتے، کوئی لاکھ چاہے ان کو راہ ملنی ناممکن ہے۔ فرمایا کہ تم ان کی ہدایت کی توقع رکھتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمھیں بھی اسی کفر میں واپس لے جانے کی آرزو رکھتے ہیں جس میں وہ خود ہیں اس وجہ سے جب تک وہ ہجرت نہ کریں اس وقت تک تم ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھو۔ یہ ہجرت ہی ان کے ایمان و اسلام کی کسوٹی ہے۔ اگر وہ اس سے گریز کرتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا ۔ ۹۰

حَصِرَ حَصَرًا کے معنی عاجز ہونا، تنگ ہونا، بے ہمت ہونا۔ حَصِرَ الرَّجُلُ ضَاقَ صَدۡرُہٗ اس کا سینہ تنگ ہوا، اس نے ہمت چھوڑ دی۔

سَلَمٌ کے معنی انقیاد و اطاعت اور حوالگی و سپردگی کے ہیں۔ اَلۡقَوۡا السَّلَمَ سے مراد کسی کے آگے سپر ڈال دینا، گھٹنے ٹیک دینا، سپر انداز ہونا اور اس سے صلح کی درخواست کرنا۔

اب یہ ان لوگوں کا حکم بیان ہو رہا ہے جو مذکورہ بالا اخذ و قتل کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔

ایک وہ جو کسی ایسی قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدۂ صلح ہے۔ ایسے لوگوں کی جان بخشی محض معاہدے کے احترام میں کی گئی اس لیے کہ معاہدے کے قیام تک ان کے کسی فرد کو گرفتار یا قتل کرنا عہد شکنی ہوتی، عام اس سے کہ وہ کافر ہے یا منافق۔

دوسرے وہ لوگ جو اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس غیر جانبداری کی درخواست لے کر آئیں، نہ وہ اپنی قوم اور قبیلہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے جنگ کے لیے آمادہ ہوں۔ ان کو مہلت دیے جانے کی یہ مصلحت واضح فرمائی کہ ایسے کمزور لوگوں کی طرف سے یہ غیر جانبداری کا رویہ بھی غنیمت ہے، آخر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ ان کو جرأت دے دیتا تو یہ کھلم کھلا دشمن بن کر تم سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو جب تک یہ تم سے تعرض کرنے سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ روش رکھیں تم بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا
رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ
وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ۔ ۹۱

'فتنۃ' کے لفظ پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں، یہاں اس سے مراد کفار کے وہ جارحانہ اور ظالمانہ اقدامات ہیں جو وہ مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے اور بزعم خویش اسلام کو مٹانے کے لیے کر رہے تھے۔

'سلطان' کا لفظ قرآن میں دلیل و حجت کے معنی میں بھی آیا ہے اور اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی۔ اس دوسرے معنی کے لیے بھی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ (ابراہیم ۲۲) (مجھے تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا) وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا (بنی اسرائیل ۳۳) (اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کے لیے قاتل پر اختیار بخشا)

یہ ان جھوٹے غیر جانبداروں کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے خطرے سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے اندر شامل رہ کر اس سے بھی مامون رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو غیر جانبداری کے مدعی تھے لیکن یہ غیر جانبداری محض نمائشی تھی۔ جب ان پر ان کی قوم کا دباؤ پڑ جاتا یہ ان شرارتوں میں شریک ہو جاتے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرنا چاہتی۔ ان لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہ لوگ اس

رعایت کے مستحق نہیں ہیں جو مذکورہ بالا جماعت کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی کھلے ہوئے دشمنوں ہی کے حکم میں داخل ہیں۔ اگر یہ تمہاری مخالفت نہ چھوڑیں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ نہ اختیار کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم جہاں کہیں پاؤ ان کو گرفتار اور قتل کرو۔ ان کو گرفتار کرنے اور ان کے قتل کرنے کا خدا نے تم کو کھلا ہوا اختیار بخشا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ
رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ
مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ
لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝
وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ
وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ ۹۲-۹۳۔

اوپر جو احکام بیان ہوئے ہیں اگرچہ اہل ایمان اور منافقین کے درمیان التباس رفع کر دینے کے لیے کافی تھے لیکن کفار کے علاقوں میں بہت سے مخلص مسلمان بھی تھے جو خود تو ہجرت کے دل سے آرزومند تھے لیکن مجبوریوں نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ جنگ پیش آجانے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ مبادا ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے قتل مومن کے جرم کی سنگینی بھی واضح فرما دی اور اس سلسلے میں ایسے واضح احکام بھی دے دیے جن کے بعد کسی خداترس مسلمان کے لیے اس معاملے میں کسی بے احتیاطی و سہل انگاری کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

پہلے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے، غلطی سے یہ فعل صادر ہو جائے تو اس کی بات دوسری ہے۔ غلطی کی صورت میں بھی لازم ہے کہ جس سے یہ غلطی صادر ہوئی ہے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا ادا کرے الا آنکہ وارثانِ مقتول خون بہا معاف کر دیں۔

پھر اس اجمال کی وضاحت فرمائی کہ اگر مقتول مسلمان دشمن قوم یا قبیلہ کا فرد ہو تب تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ لیکن اس کا تعلق اگر معاہد قوم

اور قبیلے سے ہے تو اس صورت میں خون بہا ادا کرنا بھی ضروری ہوگا اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ اگر کوئی شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنے ہوں گے۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی مشروع کی ہوئی توبہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

قتل خطا کے احکام بیان کرنے کے بعد قتل عمد کے بارے میں فرمایا کہ جو مسلمان کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب دردناک خدا نے تیار کر رکھا ہے۔

یہاں قتل عمد کے جرم کی جو سزا بیان ہوئی ہے وہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو کفر کا فروں کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس آیت کو پڑھ کر ہر مسلمان کا دل لرز اٹھتا ہے۔ اس سزا کی سنگینی کی علت سمجھنے کے لیے اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اس کی جان کا احترام ہے، کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کی جان لے لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حقوق العباد میں سے اس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی بھی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی اس لیے کہ جس شخص کے حق کو اس نے تلف کیا وہ دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہے۔ پھر اس کا ایک اور پہلو بھی بڑا اہم ہے وہ یہ کہ یہ ایک ایسے مسلمان کے قتل کا معاملہ ہے جو دارالکفر یا دارالحرب میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسلامی شریعت کے ان تحفظات سے بھی محروم تھا جو دارالاسلام میں ایک مسلمان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اس کو اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی تھی تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی اس کو قتل کر دے اور وہ بھی عمداً اور ایسی جگہ پر جہاں اس کو اسلامی قانون کی حفاظت بھی حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ نہ ایسے مقتول سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہو سکتا اور نہ ایسے قاتل سے بڑھ کر کوئی ظالم!

خون بہا کے مسئلے کے بعض پہلوؤں پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ اسلام نے اس معاملے میں عرب کے معروف کو قانون کی حیثیت دے دی تھی۔

اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق معروف سے ہوتا ہے وہ زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے متغیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خون بہا میں اونٹوں اور بکریوں کی جگہ نقد بھی دیا جا سکتا ہے اور نقد کی مقدار بھی معاشی حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس تغیر کی نوعیت کو طے کرنا ارباب اجتہاد کا کام ہے اور سلف کے اجتہادات کی نظیریں اس باب میں موجود ہیں۔

غلام کا بدل

زیر بحث آیت میں توبہ کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم بھی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ختم ہونا عین منشائے اسلام کے مطابق ہوا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ شخص کیا کرے جو غلام آزاد کرنے کی مقدرت تو رکھتا ہو لیکن غلام میسر نہیں ہیں اور شریعت نے اس کا کوئی بدل بھی معین نہیں فرمایا ہے۔ ہمارے نزدیک اس زمانے میں اس کا بدل صدقہ ہے جو غلام کی قیمت کے تناسب سے ہو اور اگر یہ صدقہ غریب و نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائگی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور سامانوں کے چھڑانے پر صرف کیا جائے تو انشاء اللہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. کا ٹکڑا بھی خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جب مفعول اس طرح فعل کے بغیر آئے تو اس پر خاص تاکید اور عزم کے ساتھ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں خون بہا کے ساتھ ساتھ ایک غلام آزاد کرنے اور غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کی جو ہدایت ہوئی تو اس پر خاص تاکید کے ساتھ زور دیا کہ یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے، نہ کوئی اس کو شاق سمجھے، نہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ قتل مومن، غلطی ہی سے سہی، عظیم گناہ ہے۔ اس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خون بہا کافی نہیں ہے بلکہ غلام بھی آزاد کیا جائے اور اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر سے ہر داغ اس گناہ کا دھل جائے۔ گویا ایسے سنگین معاملے میں زبانی توبہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے مویدات بھی ہونے ضروری ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫
فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ ۚ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا ۚ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا - ۹۴

دارالحرب میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کے تحفظ ہی کے پہلو سے مزید ہدایت یہ ہوئی کہ جب کسی علاقے پر حملہ کے لیے نکلو تو اس علاقے کے اندر جو مسلمان ہوں ان کے متعلق پوری تحقیق کر لو کہ مسلمان کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں تاکہ تمہارے حملے سے وہ محفوظ رہیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان کی شہادت کے لیے تمھیں سلام کرے تو مالِ غنیمت کی طمع میں اس کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ مالِ غنیمت کے طالبوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ کل تک یہی حال تمہارا بھی رہ چکا ہے۔ تم بھی انہی مظلوموں کی طرح کفار کے حصار میں گھرے ہوئے تھے۔ اب اللہ نے تمھیں دارالاسلام کی آزاد اور کھلی ہوئی اسلامی فضا نصیب کی ہے تو تمھیں کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اچھی طرح تحقیق کر کے اقدام کرنا چاہیے۔ اگر کسی نے اس معاملے میں بے پروائی اور سہل انگاری کو راہ دی یا مالِ غنیمت کی طمع میں کسی مسلمان کو قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ خدا تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

مومن کی جان کے احترام کی آخری حد یہی ہو سکتی ہے جو اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ دارالحرب میں عین دورانِ جنگ میں بھی اگر ایک شخص اپنے ایمان کے اظہار کے لیے سلام کر دے یا کلمہ پڑھ دے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ بغیر تحقیق کے اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔ جنگ کے ہنگامی حالات میں اس طرح کی تحقیق اگرچہ نہایت مشکل کام ہے اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے دشمن فائدہ اٹھائے لیکن اسلامی غزوات میں اس ہدایت کی پوری پابندی کی گئی۔ ایک غزوہ میں ایک صحابیؓ سے اس معاملے میں بے احتیاطی ہو گئی تو حضورؐ نے اس طرح اس پر تنبیہ فرمائی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی غزوات کا اصل مقصود فتوحات

حاصل کرنا اور مالِ غنیمت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانا تھا۔ جب اصل مقصد یہ تھا تو اس کے لیے تو ہر خطرہ گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن یہ بات کس طرح گوارا کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ۚ وَفَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۹۵-۹۶

اب یہ تمام غیر معذور مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا ہے۔ گویا آیت ۷۱ میں جہاں سے بات چلی تھی اور پھر جہاد سے جان چرانے والوں کا ذکر آگیا تھا، کلام پھر اسی طرف لوٹ آیا۔ فرمایا کہ جن مسلمانوں کے پاس کوئی معقول عذر نہیں ہے، پھر بھی وہ جہاد کے لیے نہیں اٹھ رہے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کے ہاں اجر کے لحاظ سے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکیں گے جو آج خدا کی راہ میں جان و مال دونوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس اعتبار سے دونوں گروہ اللہ کے ہاں اچھے اجر کے مستحق ہیں کہ دونوں اسلام کے مخلص ہیں، ان میں سے منافق اور اسلام کا بدخواہ کوئی بھی نہیں ہے تاہم مجاہدین کا درجہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔ ان کے لیے خدا کے ہاں اجر عظیم ہے۔

اس آیت نے جہاد کی ترغیب و تشویق کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگرچہ وہ مسلمان جو بغیر کسی عذر و مجبوری کے جہاد میں عملاً حصّہ نہیں لے رہے ہیں درجے اور مرتبے میں ان مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو عملاً جہاد میں حصہ لے رہے ہیں، ان کے درجے خدا کے ہاں بہت بلند ہیں تاہم جہاد میں حصّہ نہ لینے کی وجہ سے یہ منافق نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس لیے کہ جہاد میں عملاً حصّہ نہ لینا اس صورت میں نفاق ہے جب آدمی اس سے جی چرائے، دوسروں کی ہمت پست کرے یا جہاد کی نفیرِ عام ہو جانے کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو جہاد

ایک فضیلت ضرور ہے جس کے حاصل کرنے کا جذبہ ہر شخص کے اندر ہونا چاہیے لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ شرائطِ ایمان میں سے نہیں ہے کہ جو اس کو حاصل نہ کرے وہ منافق خیال کیا جائے۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر منافقین کو اس جہاد ہی کے معاملے میں جس طرح ملامت کی گئی ہے اور ان سے مسلمانوں کو جس طرح متنبہ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اس سے بعض لوگوں کے اندر یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ ان مخلص مسلمانوں کے بارے میں بھی ان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا جو نہایت سچے مسلمان تھے لیکن اب تک جہاد میں حصہ نہیں لے سکے تھے۔ اس آیت نے ایک طرف تو ان کو جہاد پر ابھارا، دوسری طرف یہ واضح کر دیا کہ یہ مخلص مسلمان ہیں، ان کے اخلاص کے بارے میں کسی کو بدگمانی نہیں ہونی چاہیے، اللہ کے ہاں ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ان کے لیے بھی اجر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ ۹۷-۱۰۰

تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ میں لفظ ملٰئکہ، اسی طرح جمع آیا ہے جس طرح آل عمران کی آیات ۳۹، ۴۲ اور ۴۵ میں آیا ہے۔ وہاں فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ کے تحت ہم اس کے جمع لانے کی وجہ بیان کر چکے ہیں۔ بعض مرتبہ جمع سے مقصود صرف جنس کا اظہار ہوتا ہے۔

ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حال ہے۔ اپنی جانوں پر ظلم سے مقصود یہاں ہجرت کی استطاعت [illegible] دارالکفر میں پڑے رہنا اور اس طرح اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

فِيْمَ كُنْتُمْ (تم کہاں پڑے رہے) یہ سوال زجر و توبیخ کی نوعیت کا ہے۔

مُرٰغَم کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں انسان نکل کے جا سکے۔

مُسْتَضْعَف کے معنی ہیں بے بس، مجبور، دبایا ہوا، زیردست۔

اب ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جو اب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے ہجرت پر ابھارا ہے اور یہ گویا ان کے لیے آخری تنبیہ ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی کے اب تک دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں اسی حالت میں ان کی موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس و مجبور تھے۔ فرشتے جواب دیں گے کہ کیا خدا کی زمین میں تمہارے لیے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔ پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقۃً بے بس اور معذور ہیں۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں معذور صرف وہ مرد، عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہے، یہ لوگ امید ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے۔

اس کے بعد ہجرت کی راہ میں کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہونے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے اٹھ کھڑا ہو گا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا۔ آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجرِ عظیم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دارالہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو، پھر اگر فوراً ہی اس کی موت آ گئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہو گیا۔

ان آیات سے ہجرت کے متعلق مندرجۂ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لیے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا یہ کہ اگر دارالاسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ باز ہو، کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کر کے دارالاسلام میں منتقل ہو جانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔

تیسرا یہ کہ ہجرت کے معاملے میں ہر عذر، عذر نہیں ہے، معتبر عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو نہ اس کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہرحال لازم ہے اگرچہ اس کو اصحابِ کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑ جائے۔

چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے، دنیا میں بھی مہاجر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بدرقہ فراہم ہوتا ہے۔ خدا کی زمین اس کے لیے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کے لیے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں۔

پانچواں یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے اگر نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی اگر مہاجر کو موت آ جائے تو ہجرت کا اجر اس کے لیے لازم ہو گیا۔

آگے کا مضمون۔ آیات (۱۰۱-۱۰۴)

آگے صلاۃ الخوف یعنی جنگ کے خطرات کے دوران نماز باجماعت کی شکل بتائی گئی ہے۔ جہاد کے اس ذکر کے ساتھ نماز، بالخصوص نماز باجماعت، کے اس اہتمام سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی یہ کہ اس سے نماز کی دین میں عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس سورہ کی آیت ۷۷ کے

تحت نماز اور جہاد کے باہمی ظاہری و باطنی تعلق پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نماز وہ چیز ہے کہ جنگ کے خطرات کے اندر بھی یہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں جنگ، خونریزی اور لوٹ مار کے لیے نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ دوسرے مقامات میں واضح ہو چکا ہے، اس لیے ہے کہ خدا کی زمین سے اس ظلم و جبر کا خاتمہ کیا جائے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے روکنے کے لیے اللہ کے دشمنوں کی طرف سے برپا کیا جاتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو جہاد کی اصل روح نماز ہی ہے۔ اسی سے جہاد، اللہ کی عبادت بنتا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ روح نہ ہو تو یہ بھی اسی طرح فساد فی الارض ہے جس طرح اللہ کے باغیوں کی ہر جنگ فساد فی الارض ہے۔ اس روح کے تحفظ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ عین میدانِ جنگ میں بھی تا حدِ امکان نماز سے غفلت نہ ہو تاکہ ہر مجاہد کو اس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی رہے کہ اس کی میدانِ جنگ کی صفیں بھی اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے اس کی نماز کی صفوں سے مختلف نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ اس سے نماز باجماعت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۹ ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ الآیۃ کے تحت یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ لڑائی کے دوران اگر حالات بہت پرخطر ہوں، نماز اس کے آداب کے مطابق ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار، پیادہ، کھڑے، بیٹھے، چلتے، بھاگتے جس طرح ممکن ہو ادا کرنے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ قبلہ رو ہونے کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے۔ لیکن ان سب رخصتوں کے ساتھ زیر بحث آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اگر نماز باجماعت کا اہتمام ممکن ہو تو میدانِ جنگ میں بھی اس کا اہتمام باقی رکھا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے قرآن نے ایک ایسی شکل بیان فرمائی ہے جس سے نماز باجماعت کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور دفاع کا بھی۔

تیسری یہ کہ اس سے دفاع کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اول تو یہی بات اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی اہم عبادت میں تخفیف فرما دی۔[1]

[1] ہمارا یہ خیال ہے کہ نماز میں قصر کی رخصت اصلاً سفرِ جہاد کے تعلق سے نازل ہوئی ہے۔ دوسرے سفروں میں اس کی حیثیت اصل کی نہیں بلکہ، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقے کی سی ہے۔ ہم اس پر آگے بحث کریں گے۔

دوسری یہ کہ نماز کی جو شکل بیان فرمائی ہے اس میں اس امر کا پورا اہتمام ملحوظ ہے کہ دشمن کو اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملہ کر دینے کا کوئی موقع نہ ملے۔ گویا اس مضمون جہاد کے آغاز میں مسلمانوں کو خُذُوا حِذْرَكُمْ (اپنے سامان دفاع سے لیس رہو) کا جو حکم دیا تھا تو اس کا اہتمام نماز میں بھی پوری طرح قائم رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دین فطرت میں توکل اور تدبیر، شجاعت اور حکمت، تہور اور احتیاط کا کیسا معتدل اور حسین امتزاج ہے کہ نماز بھی جہاد بن جاتی ہے۔

چوتھی یہ کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کے جذبے اور اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آگے ہم واضح کریں گے کہ نماز کی یہ خاص شکل جو یہاں بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے میدانِ جنگ میں موجودگی کی صورت میں صحابہؓ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حضورؐ نماز باجماعت کی امامت کرائیں اور کوئی مسلمان اس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی ہو۔ صحابہؓ کا یہ جذبہ چونکہ فطری تھا اور دین میں اس جذبے کی اہمیت بالکل واضح ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کی ایک ایسی شکل بیان فرما دی جس سے اس جذبے کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ
خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۱۰۱
وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ
وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ
طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ
وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ
مَيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ
أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۱۰۲
فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ
فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا ۱۰۳ وَلَا تَهِنُوا
فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَ

تَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۱۰۴

ترجمہ

اور جب تم سفر میں نکلو تو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ بے شک یہ کفار تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ۱۰۱

اور جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور نماز میں ان کی امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو، پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آگے آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے اسلحے لیے ہوئے ہوں۔ کافر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ تم اپنے اسلحے اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں اور اس بات میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے اسلحے اتار دو البتہ اپنی حفاظت کا سامان لیے رہو۔ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰۲

پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پس جب حالتِ اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز قائم کرو۔ بے شک نماز اہلِ ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ ۱۰۳

اور دشمن کے تعاقب میں تھڑدلا پن نہ دکھاؤ۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو آخر وہ بھی تو تمہاری ہی طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ ۱۰۴

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ
خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا (۱۰۱)

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ نماز میں قصر کی یہ اجازت خُذُوا حِذْرَكُمْ کے حکم کے تعلق سے

نازل ہوئی یعنی جب حکم ہُوا کہ اپنے سامانِ دفاع سنبھالیں اور کفار کے مقابلے کے لیے مستعد ہو تو یہ سوال آپ سے آپ پیدا ہُوا کہ اس حکم میں اور نماز میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی، کیونکہ نماز کی حالت میں دفاع کے لوازم پورے نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ایک تو نماز میں قصر کی اجازت ہوئی اور آگے کی آیات میں نمازِ باجماعت اور بیماری اور بارش وغیرہ کے حالات میں جو شکلیں اختیار کی جانی چاہئیں وہ بیان ہوئیں۔

قصر کی شکل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عملی تواتر سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جو نمازیں چار رکعت والی ہیں وہ دو رکعت پڑھی جائیں۔ باقی مغرب اور فجر میں قصر نہیں ہے۔

قصر کی اجازت ایک رخصت ہے

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ قصر کی اجازت ایک قسم کی رخصت ہے۔ رخصتوں کے متعلق سورۂ بقرہ کی تفسیر میں، ایک مستقل فصل میں، ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانے کو تقویٰ کے خلاف سمجھنا دین میں تشدد اور غلو کے رجحان کی غمازی کرتا ہے جس کو قرآن و حدیث دونوں میں مذموم ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی غلو سے خالی نہیں قرار دی جا سکتی کہ کسی رخصت کو عزیمت اور وجوب کا درجہ دے دیا جائے یہاں تک کہ اس کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ اس باب میں تفصیل کے طالب مذکورہ فصل پر ضرور ایک نظر ڈال لیں۔

قصر کی اجازت سفرِ جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے

قصر کی یہ اجازت اس میں شبہ نہیں ہے کہ نازل تو ہوئی ہے سفرِ جہاد ہی کے تعلق سے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ بس سفرِ جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ سفر کوئی بھی ہو اس میں فی الجملہ بے اطمینانی، آپا دھاپی اور سرو سامان کی فکر ہوتی ہی ہے۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ یہ عین ممکن ہے کہ جہاد کا ایک سفر زیادہ اطمینان سے گزر جائے اور تجارت یا حج کے سفر میں زیادہ الجھنیں پیش آجائیں۔ اس اشتراکِ علت کی وجہ سے دوسرے سفر بھی اصلاً نہ سہی تبعاً اسی حکم میں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے قسم کے سفروں میں بھی قصر کی اجازت دی۔ خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہؓ نے بھی اس پر عمل کیا۔

یہ بات بھی یہاں ملحوظ رکھنے کی ہے کہ الفاظ یہاں وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (جب تم سفر میں نکلو) کے استعمال ہوئے ہیں جو ہر سفر کے لیے عام ہیں، اس میں سفرِ جہاد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جہاد کے سفر کے لیے خاص لفظ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (جب تم اللہ کی راہ میں نکلو) کا ہے جو آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ قصر کی اجازت ہر سفر کے لیے

عام ہو۔ رہی اس کے بعد اِنْ خِفْتُمْ کی شرط تو وہ صرف آیت کے موقع نزول کے اعتبار سے اس علت کو ظاہر کر رہی ہے جس کے سبب سے یہ اجازت مرحمت ہوئی۔ اس سے یہ بات تو ضرور نکلتی ہے کہ یہ رخصت بہرحال رخصت ہے جو حالات کے تابع ہے لیکن یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ سفرِ جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تقریباً یہی صورت تعددِ ازواج والے مسئلے میں بھی ہے جس کی بحث سورہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا
اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ
يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ
وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۱۰۲)

لفظ 'حذر' کا مفہوم

لفظ 'حذر' پر آیت ۷۱ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جب تنہا استعمال ہو تو اس سے ہر قسم کے اسلحے مراد ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مجرد دفاعی و حفاظتی نوعیت کے ہوں، مثلاً سپر، خود اور زرہ وغیرہ یا جارحانہ نوعیت کے ہوں مثلاً تلوار اور بندوق وغیرہ۔ لیکن جب لفظ اسلحہ کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں ہے اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ (اپنے اسلحہ رکھ دو اور اپنا احتیاطی و حفاظتی سامان لیے رہو) تو اس سے مراد صرف وہی چیزیں ہوں گی جن کو ایک سپاہی اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

[illegible]

اس آیت میں وہ شکل بیان ہوئی ہے جو نمازِ باجماعت کے لیے میدانِ جنگ میں اختیار کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میدانِ جنگ میں موجودگی کی صورت میں ایک شکل یہ پیدا ہونے کا امکان تھا کہ قیامِ جماعت کے امکان کی شکل میں جب حضورؐ نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوتے تو ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی جس کا لحاظ بھی ضروری تھا اور ساتھ ہی دفاعی تدبیروں کا اہتمام بھی ناگزیر تھا کہ دشمن مسلمانوں کی مصروفیتِ نماز سے فائدہ اٹھا کر اچانک کوئی حملہ نہ کر دے۔ ان دونوں تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قیامِ جماعت کی تدبیر یہ بتائی کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو اور دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے۔

جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ کر وہ حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی ہے وہ امام کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز کے لیے کھڑا ہو۔

اس صورت میں نماز باجماعت کے قیام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور دفاع، تینوں کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہوگی؟ اس سوال کا جواب اس آیت سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا جس کے سبب سے اس باب میں فقہا کی رائیں مختلف ہوئیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے لیے اس ساری تفصیل کو نہ یہاں پیش کرنے کی گنجائش ہی ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہی ہے اس لیے کہ یہ شکل جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس مشکل کے حل کرنے کے لیے بتائی گئی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں پیدا ہو سکتی تھی۔ حضورؐ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ تو اتنی شدید ہو سکتی اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہی ہے، اس وجہ سے دفاع کے تقاضوں کے مطابق اہل لشکر الگ الگ اماموں کی اقتدا میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔

آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ امام قصر نماز دو رکعت ادا کرے اور مقتدیوں کے دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے پیچھے اور ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر کے اپنی نماز پوری کریں۔ امام دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے اتنا توقف کرے کہ پہلی جماعت اپنی دوسری رکعت اختصار کے ساتھ ختم کر کے پیچھے ہٹ سکے اور دوسری جماعت اس کی جگہ لے سکے۔ اس طرح مقتدی اور امام دونوں کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ امام چار رکعت پڑھے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ دو دو رکعتوں میں اس کی اقتدا کریں گے۔ اس صورت میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ امام تو اتمام کرے گا اور مقتدی قصر کریں گے، حالانکہ قصر کی اجازت جس طرح مقتدیوں کے لیے ہے اسی طرح امام کے لیے بھی ہے۔ امام و مقتدی دونوں کے حالات بھی بعینہٖ ایک ہی طرح کے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام دو رکعتیں ادا کرے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ اس کے پیچھے ایک ایک رکعت ادا کر کے اپنی نماز ختم کر دیں گے۔ اس شکل میں مقتدیوں کی نماز صرف ایک رکعت کی ہو جاتی ہے حالانکہ قصر میں بھی کوئی نماز ایک رکعت نہیں ہے۔

ہمارے اس رجحان کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح امام اور مقتدی دونوں کی نماز میں

کامل توافق ہوگا۔ نیت کے اعتبار سے بھی اور ظاہر کے اعتبار سے بھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں فَاِذَا سَجَدُوْا کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ایک رکعت مقتدیوں کو اپنے طور پر بھی ادا کرنی ہے۔ اگر یہ رکعت ادا کرنی ہوتی یا امام کی اقتدا ہی میں ادا کرنی ہوتی تو فَاِذَا سَجَدُوْا کی جگہ فَاِذَا سَجَدْتَ کے الفاظ ہوتے۔ اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سجدہ درحقیقت رکعت کی تعبیر ہے اس لیے کہ رکعت سجدہ ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اس اشارے پر ہم یہاں اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی زیادہ تفصیل میں ہم اس لیے نہیں جانا چاہتے کہ ہمارے نزدیک باجماعت صلوٰۃ الخوف کی شکل لازماً ہر حالت میں اور ہر زمانے میں یہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آیت کے الفاظ میں خود اس کی تصریح موجود ہے۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ظاہر ہے کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے ارشاد ہو رہا ہے کہ جب تم موجود ہو اور لوگوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تب یہ شکل اختیار کی جائے۔ آنحضرتؐ کی موجودگی میں اس شکل کے اختیار کرنے کی ضرورت تھی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ہر شخص آپ کی اقتدا کا ثواب بھی حاصل کر سکے اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس زمانے میں اوّل تو جنگ کی صورت ہی بالکل تبدیل ہو چکی ہے دوسرے حضورؐ کی موجودگی کا سوال بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حالات کے تقاضے کے مطابق قیام جماعت کی جو شکل اختیار کی جائے وہ اختیار کی جا سکتی ہے اور اگر قیام جماعت کا امکان نہ ہو تو جس طرح ممکن ہو پڑھی جا سکتی ہے۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیۃ یہ وجہ بیان ہوئی ہے حالت نماز میں اس شدت کے ساتھ دفاع کے اہتمام کی۔ اس سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں احتیاط کے تقاضوں سے بے پروا ہونے کی اجازت کسی حال میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیماری اور بارش وغیرہ کی تکلیف کے سبب سے اگر اسلحہ اتار رکھنے کے لیے مجبور ہونا پڑے تو صرف اسلحہ اتار سکتا ہے، حذر یعنی حفاظتی نوعیت کی چیزوں سے پھر بھی بے پروا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ الآیۃ کے ٹکڑے میں یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کفار کی سرکوبی کے لیے جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم پوری طرح مستعد رہو۔ ویسے اللہ نے تو ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر ہی رکھا ہے۔ یہ بات اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمائی گئی ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۱۰۳)

قصر کی اجازت سے نماز کے ظاہر میں جو کمی واقع ہوگی تو نماز سے فراغت کے بعد اس کی اصل حقیقت - ذکر الٰہی - کے اہتمام میں زیادہ سرگرم ہونے کی ہدایت فرمائی تاکہ اس کسر کا جبر بھی ہو جائے اور دوام ذکر الٰہی، جو روح دین ہے، کی یاد دہانی بھی ہو جائے۔ بالخصوص میدان جنگ میں اس کی خاص اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ تمام عزم و حوصلہ کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔

حالت خوف دور ہو جانے کے بعد جب حالت امن و اطمینان عود کر آئے تو معاً اقامت صلوٰۃ کا حکم بھی عود کر آئے گا۔ یعنی پوری نماز، جماعت اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنی ہوگی۔ اس آیت سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوقات کی پابندی اقامت صلوٰۃ کے شرائط میں سے ہے۔ دوسری یہ بات نکلتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقررکردہ فریضہ ہے۔ یہ بات اس طرح نکلتی ہے کہ نمازوں کی متعلق فرمایا ہے کہ یہ اوقات کے اہتمام کے ساتھ فرض ہیں۔ درآنحالیکہ اوقات نماز تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ ہیں، قرآن میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ اشارات ہیں۔

وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۱۰۴)

'القوم' کا لفظ، جب اس سیاق و سباق میں آئے گا جس سیاق و سباق میں یہاں ہے تو اس سے مراد دشمن اور حریف ہوگا۔ کلام عرب میں اس مخصوص استعمال کی مثالیں بہت ہیں۔ قرآن میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ مثلاً اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۔۔۔ ۱۴۰۔ آل عمران (اگر تمہیں کوئی چوٹ پہنچی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، آخر دشمن کو بھی اسی طرح کی چوٹ پہنچی)

یہ سی ترغیب جہاد کے مضمون کی تاکید مزید ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے بلکہ یہاں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ اگر تمہیں دشمن کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس سے بددل ہو کر اس کے تعاقب میں تمہیں پست ہمت نہیں ہونا چاہیئے۔ نقصان جس طرح تمہیں پہنچتا ہے انھیں بھی پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے تم اور وہ یکساں ہو۔ اب رہی عاقبت کار کی کامیابی تو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، وہ سو فیصد تمہاری ہی ہے۔ اس میں ان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں ہے تو اس وقتی اور عارضی نقصان سے کیوں پست ہمت ہو۔ یاد رکھو کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اگر وہ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے، ان کو کوئی

مُطالعۂ حَدیث

مولانا عبدالغفار حسن

جہاد کی اعلیٰ قسم

—۲—

۳۔ امام سفیان ثوری کا بیان ہے۔ جب ابوجعفر منصور حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے تو انھوں نے کہا کہ سفیان ثوری سے میری ملاقات انتہائی ضروری ہے۔ لوگ میری گھات میں رہے اور بیت اللہ کے قریب انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور منصور کے پاس لے گئے۔ جب میں منصور کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور کہا کہ تم ہمارے پاس کیوں نہیں آیا کرتے تاکہ ہم اپنے معاملات آپ سے مشورہ کرسکیں اور اس کے مطابق اپنا رویہ اختیار کرسکیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے اس سفر میں کیا کچھ خرچ کیا۔ منصور نے جواب دیا مجھے کیا معلوم، میں نے وکیل اور نائب مقرر کئے ہوئے ہیں۔ وہ سب حساب جانتے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ کل جب تم خدا کے سامنے کھڑے ہوگے تو وہ اس بارے میں باز پرس کرے گا۔ تم کیا جواب دو گے؟ حضرت عمر کا تو یہ حال سنا کہ جب انھوں نے حج کیا تو اپنے غلام سے پوچھا کہ اس سفر میں کیا خرچ ہوا ہے؟ غلام نے کہا "اٹھارہ دینار" حضرت عمر نے فرمایا افسوس! ہم نے مسلمانوں کے بیت المال پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے"۔ اس کے بعد ابوسفیان نے کہا کہ حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "جو شخص اللہ کے مال میں اور اس کے رسول کے مال میں گھپلے اڑاتا ہے اس کے لئے کل جہنم کی آگ ہے۔ اس موقع پر منصور کے سیکرٹری ابوعبیداللہ نے کہا "کیا امیرالمومنین کے سامنے اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں پوری مومنانہ قوت کے ساتھ حضرت سفیان نے جواب دیا، تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں، خاموش رہو۔ فرعون نے ہامان کو ہلاک کیا تھا اور ہامان فرعون کی بربادی کا سبب بنا تھا[لہ]

۴۔ اندلس کا مشہور اموی خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے "زہراء" نامی ایک شہر تعمیر کیا اور اس میں شاندار محلات بنوائے۔ وہ دن رات اس کی زینت و آرائش کی دھن میں رہتا تھا خود بہ نفس نفیس

لہ سراج الملوک صد ۱۵۔ بشرح مسند احمد" از احمد محمد شاکر"

اس میں حصہ لیتا تھا۔ اس کا انہماک یہاں تک بڑھا کہ ایک دن نماز جمعہ سے بھی رہ گیا۔

اس زمانے میں منذر بن سعید جامع مسجد کے خطیب اور شرعی عدالت کے قاضی تھے انہوں نے سوچا کہ خلیفہ الزہراء کی تعمیر و آرائش میں حد سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ فضول خرچی کی انتہا ہو گئی ہے۔ اگر اس کو بر سر منبر نہ ٹوکا گیا تو یہ خدا کے ہاں فرض کی ادائیگی میں بہت بڑی کوتاہی ہو گی جمعہ کا دن آیا وہ منبر پر تشریف لائے خلیفہ ناصر بھی موجود تھا۔ پوری مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی انہوں نے اپنے خطبے کا آغاز اس آیت کو پڑھتے ہوئے کیا۔

اتبنون بکل ریع اٰیۃ تعبثون
وتتخذون مصانع لعلکم
تخلدون واذا بطشتم بطشتم
جبارین فاتقوا اللہ واطیعون
واتقوا الذی امدکم
بما تعلمون امدکم بانعام
وبنین، وجنات وعیون
انی اخاف علیکم عذاب
یوم عظیم۔ (سورہ الشعراء آیت ۱۳۰)

کیا تم بناتے ہو ہر بلند مقام (یادگار کے طور پر)
عبث (بلا ضرورت) اور بناتے ہو بڑے محل
شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب تم کسی پر دارو
گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر بن کر دارو گیر کرتے
ہو سو تم کو چاہئے کہ اللہ سے ڈرو اور میری
اطاعت کرو اس سے ڈرو جس نے تمہاری ان
چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) مویشی
بیٹوں باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی
مجھ کو تمہارے حق میں اگر تم ان حرکات سے باز
نہ آئے (ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا
اندیشہ ہے۔

اس کے بعد قاضی موصوف نے سورہ نساء کی یہ آیت تلاوت کی قل متاع الدنیا قلیل والاخرۃ خیر لمن اتقٰی کہہ دیجئے کہ دنیا کا متاع (سامان) تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

ان آیات کی تشریح کے بعد پورے زور دار انداز میں انہوں نے اس فضول خرچی پر سرزنش کی اور پھر یہ آیت پڑھی۔

افمن اسس بنیانہ
علی تقوٰی من اللہ ورضوان
خیر امن اسس بنیانہ

پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت
(مسجد) کی بنیاد خدا سے ڈرنے پر اور خدا کی خوشنودی
پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنا

علیٰ شفا جرف ھار فانھار
بہ فی نار جھنم واللہ لا
یھدی القوم الظلمین
(التوبۃ)

کسی کھائی (یعنی غار) کے کنارے پر جو گرنے ہی کو
ہو رکھی ہو۔ پھر وہ (عمارت) اس (بانی) کو لے
کر آتش دوزخ میں گر پڑے اور اللہ تعالیٰ ایسے
ظالموں کو (دین کی) سمجھ ہی نہیں دیتا۔

یہ پورا خطبہ اسی موضوع پر جاری رہا۔ سننے والے انتہائی متاثر ہوئے۔ خود خلیفہ ناصر سمجھ گیا کہ اس خطبے کا مخاطب خود اس کی ذات ہے۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ اپنی کوتاہی پر بہت ہی نادم ہوا۔ خلیفہ ناصر اس بات کو نہ برداشت کر سکا کہ علانیہ طور پر پوری شدت کے ساتھ اس کا محاسبہ ہو اور بر سر منبر اس کی غلطیوں پر ٹوکا جائے۔ اس موقع پر اس نے اپنے بیٹے حکم سے شکوے کے طور پر کہا خدا کی قسم! منذر کے خطبے کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ اس نے مجھ پر بڑی زیادتی کی اور تنقید و احتساب اس حد سے بڑھ گیا۔ انتہائی غصے میں خطبے کے کلمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے کہا بخدا میں اس کے پیچھے جمعہ کی نماز نہیں ادا کروں گا۔ اس کے بعد میں دوسری مسجد جامع قرطبہ میں جمعہ کی نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ یہ تھی خلیفہ ناصر کی جانب سے منذر بن سعید کی سزا کہ صرف اس کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا۔

خلیفہ ناصر کے بیٹے حکم نے یہ دیکھا کہ اس کے والد کو الزہراء کے ساتھ بہت گہرا قلبی لگاؤ ہے اور ساتھ ہی وہ الزہراء کی وسیع ترین مسجد میں نماز پڑھنے کو اہمیت دیتا ہے تو اس نے کہا — ابا جان! آخر وہ کونسی رکاوٹ ہے جس کی بنا پر منذر بن سعید کو ان کے منصب سے ہٹا نہیں دیتے۔ آپ ان کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے، لیکن ان کو امامت کے منصب پر برقرار رکھا ہوا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ خلیفہ الناصر نے ڈانٹتے ہوئے کہا کیا منذر بن سعید جیسا آدمی جو اپنے علم و فضل میں یکتا ہے معزول کیا جا سکتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس نفس کو خوش کر لیا جائے جو صراط مستقیم سے ہٹ گیا ہے یہ ممکن نہیں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اپنے اور اس کے درمیان منذر بن سعید جیسے زاہد و متقی آدمی کو شفیع اور سفارشی نہ بناؤں۔ منذر بن سعید نے تو اس طرح میرے غصے کو بھڑکا دیا کہ میں قسم کھا بیٹھا۔ اب میری دلی تمنا ہے کہ کوئی مجھے ایسی راہ مل جائے کہ میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کر سکوں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا منذر بن سعید اپنے آخری سانس اور میرے آخری سانس تک جمعہ پڑھاتے رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بدل ملنا ناممکن ہے۔[1]

[1] مجلۃ الازھر رمضان ۱۳۸۶ھ و اخلاقنا الاجتماعیۃ لسباعی۔

۵۔ خلیفہ عباسی المقتفی لامر اللہ نے یحییٰ ابن سعید جیسے ظالم کو قاضی بنا دیا۔ اس پر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی حمیت جوش میں آئی اور انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تم نے انتہائی ظالم و جابر مسلمانوں پر مسلط کر دیا ہے۔ کل خدا کے ہاں کیا جواب دو گے۔ خلیفہ اس پر کانپ اٹھا۔ اس نے فوراً اس ظالم حاکم کو معزول کر دیا[1]۔

۶۔ العز بن عبدالسلام جن کا لقب سلطان العلماء ہے۔ جب ان کو الملک الصالح اسماعیل کی جانب سے ۶۳۷ھ میں جامع مسجد دمشق کی خطابت کا منصب سونپا گیا تو اپنی حق گوئی کی بناء پر زیادہ دیر تک اس منصب پر برقرار نہ رہ سکے ۶۳۸ھ میں ان کو معزول ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ملک اسماعیل نے مسلمانوں سے خیانت اور غداری کی۔ العز بن عبدالسلام اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ جامع مسجد کا منبر جو کہ حقیقت میں منبر نبوی ہے مداہنت اور حق کے بارے میں خاموشی سے آلودہ ہو۔ حق گوئی کا بدلہ یہ ملا کہ اس منصب سے معزول کئے گئے اور قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قابل اعتبار مؤرخین نے لکھا ہے کہ ملک اسماعیل کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس پر حاکم مصر نجم الدین ابن ایوب حملہ نہ کر دے۔ اس لئے اس نے صلیبی فرنگیوں سے معاہدہ کر لیا کہ نجم الدین کے مقابلے میں اس کی مدد کریں گے۔ اور اس مدد کے عوض چند قلعے اور شہر ان کے حوالے کر دیئے۔ جنگی لحاظ سے ان قلعوں کی بڑی اہمیت تھی۔ پھر مزید یہ کہ ملک اسمٰعیل نے فرنگیوں کو اجازت دے دی کہ وہ دمشق میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتے ہیں اور اسلحہ خرید سکتے ہیں۔ العز بن عبدالسلام نے اس واقعہ پر محض فتویٰ ہی نہیں دیا بلکہ بر سر منبر اس طرز عمل کی مذمت کی اور اس خیانت کے نتائج کو بے نقاب کیا۔

اس زمانے میں خطبہ جمعہ میں حکام کے لئے دعا ہوتی تھی۔ اور اس کو اطاعت و وفاداری علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن العز بن عبدالسلام نے اس واقعہ کے بعد سے اس کے لئے دعا کے الفاظ استعمال کرنے ترک کر دیئے۔ اس کے بجائے وہ یہ دعا کرتے تھے۔

اللھم ابرم لھذہ الامۃ	اے اللہ اس امت کو شریعت کے مطابق ایسا
ابرام رشد تعز فیہ	استحکام اور مضبوطی عطا فرما جس کی بنا پر تیرے
اولیاءک و تذل فیہ	دوست عزت و رفعت پائیں اور تیرے دشمن

[1] قلائد الجواہر ص۵

اعداءک و یعمل فیہ بطاعتک	ذلیل و خوار ہوں تیری شریعت کے مطابق
وینھیٰ فیہ عن معصیتک	عمل ہو اور تیری نافرمانی سے روکا جائے۔

اس موقع پر ملک اسماعیل دمشق میں موجود نہیں تھا۔ جب اسے اس خطبہ جمعہ کی اطلاع ملی تو اس نے خطابت جمعہ سے معزول کر کے اور جیل میں ڈال دینے کا حکم دے دیا اور جب وہ دمشق پہنچا تو اس نے جیل سے تو رہا کر دیا لیکن گھر میں نظر بندی کے احکام جاری کر دیئے اور فتویٰ دینے سے روک دیا[1]۔

۷۔ غازان تاتاری، مسلمان تاتاریوں میں پہلا بادشاہ تھا۔ اس کے مقابلے میں امام احمد بن تیمیہ نے انتہائی جرأت مندانہ اقدام کا ثبوت دیا اور حق گوئی کی اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ۶۹۹ھ کے اواخر میں اطلاع ملی کہ غازان تاتاری حلب پر چڑھائی کر رہا ہے وادی سلمیہ میں ۲۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو غازان کے لشکر کی ناصر بن قلاوون کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انتہائی شدید معرکے کے بعد ناصر کو شکست ہوئی۔ فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ ناصر اس کے اعیان و انصار سب کے سب دمشق سے مصر کی جانب پناہ کے لئے دوڑ پڑے۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ دمشق میں نہ کوئی حاکم باقی رہا نہ کوئی ذمہ دار افسر۔ لیکن اس موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے عوام کا ساتھ دیا اور وہ دمشق میں ٹھہرے رہے۔ تھوڑے سے بہت ذمہ دار افراد شہر میں باقی رہ گئے تھے۔ ان کو لے کر غازان سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ وفد کے رئیس خود شیخ الاسلام تھے۔ النبک نامی بستی میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں کے درمیان انتہائی تلخ گفتگو ہوئی۔ شیخ الاسلام نے غازان پر کڑی تنقید کی کہ اس نے عہد کو توڑا اور مسلمانوں کی آبادی میں بے جا دخل اندازی کی ہے۔ اس گفتگو کی پوری تفصیل ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں دی ہے راوی کا بیان ہے کہ ابن تیمیہ نے غازان سے کہا (بذریعہ ترجمان) ہمیں معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو۔ تمہارے ساتھ قاضی، امام، علماء اور مؤذن بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تم نے ہمارے ملک پر چڑھائی کر ڈالی۔ اور ہمارے علاقے میں گھس آئے۔ آخر یہ کیوں تمہارے باپ دادا کافر تھے۔ لیکن انہوں نے معاہدہ کے بعد اسلامی علاقوں پر چڑھائی نہیں کی لیکن تم نے معاہدہ کیا اور اسے توڑ ڈالا۔ قول و قرار کیا۔ لیکن اس کی پاسداری نہ کی۔ اس

[1] طبقات السبکی۔

گفتگو میں اس تنقید کا انداز انتہائی جرأت مندانہ تھا اور صرف اللہ کے لئے انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ان کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔

اس کے بعد غازان نے وفد کو کھانے پر دعوت دی۔ وفد کے تمام اراکین کھانے پر بیٹھ گئے۔ لیکن امام ابن تیمیہ نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ جب اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں یہ کھانا کیسے کھا سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ لوٹ مار سے حاصل کیا گیا ہے اور لوگوں کے درخت کاٹ کر اسے پکایا گیا ہے۔ غازان بڑی توجہ سے امام ابن تیمیہ کی باتیں سنتا رہا اور امام صاحب کی ہیبت سے اس کا دل بھرپور ہو گیا۔ اس نے پوچھا یہ شیخ کون ہیں۔ میں نے ان جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ بڑے ہی جرأت مند تھے۔ میں نے آج تک کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی بات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہو اور نہ کوئی میں نے ایسا فرد دیکھا ہے جس کے سامنے میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں۔ اس شخصیت کے سامنے بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ لوگوں نے امام ابن تیمیہ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی تفصیل بتائی۔ اس پر غازان نے ان سے دعا کی درخواست کی۔ امام ابن تیمیہ نے دعا ان الفاظ میں کی۔

وقال اللهم ان كان عبدك هذا انما يقاتل لتكون كلمتك العليا ويكون الدين كله لك فانصره وايده وملكه العباد والبلاد وان كان قام رياء وسمعة وطلبا للدنيا ولتكون كلمته هي العليا وليذل الاسلام واهله فاخذله وزلزله ودمره واقطع دابره

یعنی اے اللہ اگر یہ تیرا بندہ اسلئے جنگ کرتا ہے کہ تیرا حکم بلند ہو اور یہ کہ تیری فرمانروائی کا غلبہ ہو تو اس کی مدد فرما۔ اس کی تائید کر اپنے بندوں اور اپنی زمین پر اس کو غلبہ دے۔ اور اگر یہ ریا و نمائش کے طور پر کھڑا ہوا ہے اور دنیا طلبی اس کا مقصد ہے۔ اور یہ اپنا کلمہ بلند کرنا چاہتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرنا اس کا مطلوب ہے، تو اے اللہ اس کو پکڑ لے۔ ہلا ڈال اس کو تباہ کر۔ اس کی نسل کاٹ دے۔

غازان ہاتھ اٹھائے ہوئے دعا پر آمین آمین کہہ رہا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے خوف سے اپنے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیئے کہ کہیں ابن تیمیہؒ کو قتل کرنے کا حکم نہ دے دیا جائے اور ہمارے کپڑے اس کے خون سے آلودہ نہ ہو جائیں۔ جب ہم اس کے دربار سے نکلے تو قاضی القضاۃ نجم الدین اور دوسروں نے امام صاحب سے کہا کہ تم نے تو آج ایسی گفتگو کی کہ اپنی اور ہماری

ہلاکت کا سامان فراہم کر لیا۔ خدا کی قسم اب یہاں سے ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ امام ابن تیمیہ نے کہا کہ میں بھی تمہاری رفاقت نہیں چاہتا۔ راوی کا بیان ہے کہ قاضی القضاۃ اور دوسرے ساتھی ایک ٹولی کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اور امام ابن تیمیہ چند ساتھیوں سمیت کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئے۔

غازان کے امراء و وزراء کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو سب دعا کرانے کے لئے امام کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

امام ابن تیمیہ تین سو سواروں کے ساتھ دمشق واپس ہوئے۔ راستے میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا لیکن جن لوگوں نے امام ابن تیمیہ کی رفاقت سے انکار کیا تھا ان پر راستے میں تاتاریوں کی ایک جماعت نے حملہ کر دیا۔ سامان چھین لیا اور کپڑے اتار لئے۔[1]

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علماء حق کی تنقید ان امور پر تھی جو شریعت اسلامیہ کے خلاف تھے۔ اس تنقید اور انکار منکر سے حکام کی ذات کو طعن و تشنیع کا نشانہ مقصود نہ تھا۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام کے علاوہ امت کا کوئی فرد بھی معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ خوش نصیب وہ ہے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور نصیحت قبول کر کے صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے۔

یہاں سے وہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء اسلام نے گذشتہ دور میں کس طرح جرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ غلط کار حاکموں کے مقابلے میں اعلان حق کیا خواہ اس اعلان حق کی پاداش میں ان کو اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کر دینی پڑی۔

۱۔ حطیط زیات نامی ایک عالم حجاج کے پاس لائے گئے۔ حجاج نے ان سے پوچھا کیا تم حطیط ہو؟ انہوں نے جواب دیا "ہاں"۔ "جو چاہے تم مجھ سے پوچھو۔ میں مقام ابراہیم کے پاس اپنے رب سے عہد کر چکا ہوں کہ ہر سوال کے جواب میں سچ بولوں گا۔ آزمائش کا دور آیا تو ثابت قدم رہوں گا۔ اور اگر راحت و عافیت میسر آئی تو اپنے رب کا شکر کروں گا۔"

حجاج نے کہا میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ جواب دیا میرے نزدیک تو اللہ کے دشمنوں میں سے ایک ہے تو دین کی حرمتوں کو پامال کرتا ہے اور محض تہمت اور شک و شبہ

[1] مختصر منہاج السنۃ ذہبی ص ۳۳۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۴

کی بنا پر بے گناہوں کو قتل کرڈالتا ہے۔" حجاج نے کہا "امیر المومنین عبد الملک بن مروان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ جواب دیا اس کا جرم تیرے جرم سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ خود تیرا وجود اس کے جرائم کا ایک حصہ ہے۔ یہ باتیں سن کر حجاج غصے میں آگیا اور حطیط کو سزا دینے اور سخت عذاب کا مزا چکھانے کا حکم دے دیا۔ عذاب دینے کی انتہائی شکل یہ اختیار کی گئی کہ بانس کی کھپچیاں چیری گئیں اور ان کو بدن کے گوشت والے حصے پر رکھ کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ پھر انہوں نے ان کھپچیوں کو واسطے کھینچنا شروع کیا کہ گوشت ہڈیوں سے الگ ہوگیا راوی کا بیان ہے کہ اس اللہ کے بندے نے اُف تک نہ کی۔

اس موقع پر حجاج سے کہا گیا کہ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔ حجاج نے کہا اسے یہاں سے نکال کر بازار میں سڑک پر پھینک دو۔ جعفر راوی کا بیان ہے کہ میں اور حطیط کا ایک دوست اس کے پاس پہنچے اور ہم نے اس سے کہا اگر کوئی ضرورت ہے تو بتاؤ جواب دیا "پانی کا ایک گھونٹ۔" فوراً پانی لایا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس جواں سال، باہمت حق گو نے جامِ شہادت نوش کیا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ حطیط زیاتؒ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شہادت، شہادت فی سبیل اللہ تھی اور حجاج کا یہ ظلم ایسا نہیں ہے کہ جس کی خدا کے ہاں گرفت نہ ہو۔

قیامت کے دن جب تمام جھگڑے پیش ہوں گے اور تمام مظلوم فریادی وہاں جمع ہونگے تو اُس دن حجاج اس خوفناک ظلم کی سزا پاکر رہے گا۔[ا]

۹۔ بنی اُمیہ کو دمشق سے نکالنے کے بعد جب عبد اللہ بن علی وہاں پہنچے تو اس نے امام اوزاعیؒ کو طلب کیا، امام اوزاعی تین دن غائب رہنے کے بعد اس کے سامنے پیش ہوگئے۔ امام اوزاعیؒ کا خود اپنا بیان ہے کہ میں اس کے پاس اس حال میں پہنچا کہ وہ اپنے تخت پر براجمان تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں چھڑی تھی۔ اس کے دائیں بائیں حبشی فوجی کھڑے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ میں نے اس کو سلام کیا لیکن اس نے جواب نہ دیا اور اس نے اپنی چھڑی کو ہلاتے ہوئے کہا "اے اوزاعی! تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم نے بنی اُمیہ کے ظلم سے اس سرزمین کو پاک کر دیا ہے بتاؤ یہ جہاد ہے یا نہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا

[ا] احیاء العلوم جلد ۲

رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّ لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ"

ترجمہ: "اعمال کا مدار نیتوں پر ہے تو بلاشبہ ہر انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی جس نے ہجرت کی اللہ اور رسول کی طرف تو واقعی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے اور جس نے ہجرت کی دنیا کمانے کے لئے اور یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لئے اس کی ہجرت اس چیز کی طرف مانی جائے گی جس کا اس نے قصد کیا ہے۔ یہ سن کر عبد اللہ بن علی نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے اپنی چھڑی زمین پر ماری۔ اس پاس کے فوجیوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ تلواروں کے دستوں پر رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا "اوزاعی! بنی اُمیہ کے خون کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اوزاعی کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین وجوہ کی بنا پر۔

(۱) جان کے بدلے جان۔ (۲) شادی شدہ بدکار (۳) مرتد۔

اس نے اپنی چھڑی کو پہلے سے بھی زیادہ زور سے ہلاتے ہوئے کہا کہ بنی اُمیہ کے مال و دولت کے بارے میں جو کہ ان سے چھینی گئی ہے تمہاری کیا رائے ہے؟ جواب میں کہا اگر یہ مال ان کے ہاتھوں میں حرام طریقے سے آیا تھا تو تمہارے لئے بھی حرام ہے اور اگر انہوں نے حلال طریقے سے حاصل کیا تھا تو تمہارے لئے بھی اُسی وقت حلال ہو سکتا جب تم اسے جائز طریقے سے حاصل کرو۔

اس نے پوری شدت سے پھر اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے کہا کیا ہم تمہیں قاضی بنا دیں؟ میں نے جواب میں کہا "تمہارے باپ دادا نے کبھی مجھے اس مشقت میں نہیں ڈالا اور میں چاہتا ہوں کہ اس احسان کو تکمیل تک پہنچایا جائے جس کی ابتدا تمہارے بزرگوں نے کی تھی۔ عبد اللہ بن علی نے کہا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے چھٹی مل جائے۔ میں نے جواب دیا "ہاں"۔ میں اب رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ میرے اہل و عیال میرے انتظار میں ہیں۔ وہ اپنی ضروریات کے لئے میرے محتاج ہیں۔ اُن کے دل میری تاخیر کی وجہ سے بے چین ہوں گے"۔ امام اوزاعیؒ کا بیان ہے کہ میں اب اس انتظار میں تھا کہ میرا سر تن سے جدا ہو جائے۔ لیکن نہ معلوم کیا بات

ہوئی مگر اس نے مجھے واپس لوٹنے کی اجازت دے دی ۔ [1]

۱۰۔ خلیفہ ابوجعفر منصور نے ایک مرتبہ عبداللہ بن طاؤس کو بلایا جو اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ امام مالک اور ابن طاؤس دونوں جب اس کے پاس پہنچے تو کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے سوال کیا اے ابن طاؤس! کوئی ایسی حدیث سناؤ جسے تمہارے باپ طاؤس نے روایت کیا ہو۔" ابن طاؤس نے کہا میرے والد نے مجھے حدیث بیان کی تھی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت میں حصہ دار ٹھہرایا ہو تو اس نے انصاف کے بجائے لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے ہوں۔ پھر کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ امام مالک کا بیان ہے کہ میں نے اپنے کپڑے اس اندیشے سے سمیٹ لیے کہ کہیں اس کے خون سے آلودہ نہ ہو جائیں پاس کے بعد ابوجعفر نے کہا اے طاؤس کے بیٹے! مجھے کچھ نصیحت کر۔ ابن طاؤس نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الم تر کیف فعل ربک بعاد، ارم ذات العماد، التی لم یخلق مثلھا فی البلاد، وثمود الذین جابوا الصخر بالواد، وفرعون ذی الاوتاد، الذین طغوا فی البلاد، فاکثروا فیھا الفساد، فصب علیھم ربک سوط عذاب، ان ربک لبالمرصاد (سورۃ الفجر)

ترجمہ:- کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستونوں جیسے دراز تھے اور جن کی برابر زور و قوت میں دنیا بھر میں کوئی نہیں پیدا کیا گیا۔ اور قوم ثمود جو وادی القریٰ میں چٹانیں تراشا کرتے تھے۔ اور میخوں والا فرعون ان سب نے ملکوں میں سر اٹھایا تھا اور بہت زیادہ فساد برپا کیا تھا تو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بے شک آپ کا رب نافرمانوں کی گھات میں ہے۔

امام مالک کا بیان ہے اس موقع پر پھر میں نے اپنا دامن سمیٹ لیا کہ خون کے چھینٹے مجھ پر نہ پڑ جائیں۔ منصور نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا "مجھے یہ دوات دیدو" کچھ وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا "مجھے یہ دوات پکڑا دو"۔ لیکن ابن طاؤس یہ حکم بجا نہ لائے منصور نے کہا اس دوات کو دینے سے کون سی چیز مانع ہے؟" انھوں نے جواب دیا "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تم اس دوات کی سیاہی سے کوئی ایسی گناہ کی بات نہ لکھ ڈالو جس بنا پر میں بھی تمہارا شریک گنے

[1] مجلۃ العربی عدد ۱۸۱ ۱۹۷۳ء

ٹھہرا دیا جاؤں۔ منصور نے جب یہ سنا تو غضبناک ہو کر اس نے کہا تم دونوں میرے پاس سے چلے جاؤ۔ ابن طاؤس نے کہا "ہماری بھی یہی خواہش ہے"۔ [1]

امام مالک کہتے ہیں اس واقعہ سے میں ابن طاؤس کی فضیلت و عظمت کا قائل ہو گیا۔

قعقاع بن حکیم کا بیان ہے کہ میں ایک دن خلیفہ مہدی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس دور کے بہت بڑے عالم سفیان ثوری کو لایا گیا انھوں نے دربار میں داخل ہو کر سلام کیا یعنی سلام مسنون کے ذریعہ مخاطب کیا۔ لیکن سلام خلافت کہنے سے پرہیز کیا یعنی یہ نہیں کہا۔ السلام علیک یا خلیفۃ المسلمین۔ اس موقع پر مہدی کا وزیر ربیع تلوار پر ٹیک لگائے خلیفہ کے بازو میں کھڑا ہوا تھا اور اس کے حکم کا منتظر تھا۔ خلیفہ مہدی نے مسکراتے ہوئے سفیان سے کہا کہ تم ادھر ادھر چھپے پھرتے ہو تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر ہم تمہیں سزا دینا چاہیں تو ہم تمہیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں گے۔ اب بولو اب تو تم ہماری گرفت میں آگئے ہو کیا تمہیں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ ہم جس طرح چاہیں اپنی خواہش کے مطابق تمہارے بارے میں فیصلہ کر ڈالیں۔ سفیان ثوری نے جواب دیا آپ اگر میرے بارے میں فیصلہ کریں گے تو یہ بھی یاد رکھئے کہ آپ کے بارے میں وہ ذات فیصلہ کرے گی جو قادر مطلق ہے۔ جس کے ہاں حق اور باطل کے درمیان پوری طرح فرق کر دیا جائے گا۔ ربیع نے خلیفہ سے کہا امیر المومنین! کیا اس جاہل کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس قسم کی گستاخانہ باتیں آپ کے سامنے کرے آپ کی اجازت ہو تو میں اس کی گردن ماردوں مہدی نے جواب میں کہا "افسوس ہے تم پر، خاموش رہو۔ تمہارا ارادہ یہ ہے کہ ہم سفیان جیسی ہستی کو قتل کر کے بدبختی میں مبتلا ہو جائیں میرا فیصلہ یہ ہے کہ امام ثوری کو کوفہ کا قاضی بنا دیا جائے اس بارے میں کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں کی جائے۔ یہ حکم لکھ کر امام ثوری کو دے دیا گیا۔ امام ثوری نے یہ خط لیا اور باہر نکل کر دجلہ کی موجوں کے حوالے کر دیا اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کو ملک کے کونے کونے میں ڈھونڈا گیا لیکن وہ نہ مل سکے۔ ان کی جگہ شریک النخعی کو قاضی بنایا گیا ۔ [2]

۱۲۔ فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے گھر میں تھا۔ کپڑے اتار کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک زور دار دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ مَنْ ھٰذا؟ (کون ہے؟)

[1] مجلۃ العربی عدد ۱۸۱ ۱۹۷۳ء   [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱

دستک دینے والے نے کہا باہر آئیے۔ امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔ میں اپنے کپڑوں میں الجھتے ہوئے دوڑ کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفہ ہارون الرشید میرے دروازے پر کھڑے ہیں چہرے پر فکر و غم کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے کہا اے امیر المومنین! اگر آپ مجھے بلا بھیجتے تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ آپ نے خواہ مخواہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔ خلیفہ نے جواب دیا ان باتوں کو چھوڑو۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ آج رات کچھ ایسا خیال دل میں آیا کہ جس نے نیند اڑا دی اور دماغ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ کوئی ایسا عالم باعمل بتاؤ جس کے سامنے میں اپنی الجھن پیش کر سکوں فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ میں خلیفہ کو لے کر اس وقت کے مشہور زاہد فضیل بن عیاض کے پاس پہنچا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے حجرے میں نماز میں مشغول ہیں اور ان کی زبان پر یہ آیت ہے ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین آمنوا وعملوا الصلحٰت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون ○ کیا مجرموں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر درجہ دیں گے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت دونوں برابر شمار ہوں گی؟ کیا ہی برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ (سورۃ الجاثیہ)

خلیفہ ہارون نے کہا۔ اگر کسی شخص سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو وہ یہی بزرگ ہیں میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے جواب طلا کون ہیں میں نے کہا امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ میرا ان سے کیا تعلق؟ میں نے کہا سبحان اللہ! کیا ان کی آپ پر اطاعت فرض نہیں ہے۔ فضیل بن عیاض نے جواب دیا کیا یہ آں حضور کی حدیث نہیں ہے "لیس للمومن ان یذل نفسہ" مومن کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے پھر وہ اپنے بالاخانے سے اتر کر اندر۔ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں واپس چلے گئے اور چراغ بجھا دیا۔ اور کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ان کو ٹٹولنے لگے۔ مجھ سے پہلے خلیفہ ہارون رشید کا ہاتھ فضیل بن عیاض تک پہنچ گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا اُف! کیا نرم نازک ہتھیلی ہے؟ اگر اللہ کے عذاب سے نجات پا جائے۔

فضل بن ربیع نے کہا کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آج ایک پارسا دل سے پاکیزہ کلام سنیں گے۔ خلیفہ نے فضیل بن عیاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جس غرض کے لئے ہم آئے ہیں اس کے بارے میں کچھ بات کیجئے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ فضیل نے کہا۔ آپ کس کام کے لئے آئے ہیں؟ آپ کا تو یہ حال ہے کہ رعیت کے گناہ آپ نے اپنے اوپر لاد لئے ہیں

اس رعیت کو ذلت و رسوائی کا عذاب چکھایا ہے۔ آپ نے اور آپ کے مقرب افسروں نے۔ ان کے گناہوں کی سزا بھی آپ کو ملے گی۔ آپ ہی کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا میں فساد برپا کیا اور آپ ہی کے سہارے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے لیکن یہی لوگ قیامت کے دن آپ کو سب سے زیادہ ناپسند ہوں گے اور سب لوگوں سے پہلے آپ سے کنارہ کشی اختیار کریں گے۔ حساب کے دن اگر آپ ان سے یہ مطالبہ کریں گے کہ آپ کے گناہ کا بوجھ وہ اٹھالیں تو وہ کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے۔ جو شخص آج جس قدر محبوب ہے۔ وہ اسی قدر قیامت کے روز آپ سے دور بھاگے گا۔ فضیل بن عیاض نے کہا عمر بن عبدالعزیز کو جب خلافت کا منصب سونپا گیا تو انہوں نے اپنے زمانے کے تین نیک علماء کو بلایا۔ یعنی سالم بن عبداللہ، محمد بن ابی کعب اور رجاء بن حیات۔ ان سے عمر بن عبدالعزیز نے کہا میں اس آزمائش میں پھنس گیا ہوں مجھے مشورہ دو" فضیل نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ عمر بن عبدالعزیز نے منصب خلافت کو ایک آزمائش اور مصیبت قرار دیا اور آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔

عمر بن عبدالعزیز کے سوال کے جواب میں تینوں احباب نے باری باری کہا۔

۱۔ سالم بن عبداللہ بولے "اگر آپ کل نجات کے متمنی ہیں تو اس دنیا سے روزہ رکھ لیجئے یعنی دنیا کی ہوس سے پرہیز کیجئے اور اس روزے کو موت کے پیالے سے افطار کیجئے۔"

۲۔ محمد بن کعب نے کہا "اگر تم نجات چاہتے ہو تو تمہارا فرض ہے جو مسلمانوں میں سن رسیدہ ہیں ان کو بمنزلہ باپ کے سمجھو جو درمیانی عمر کے ہیں ان سے بیٹوں جیسا برتاؤ رکھو۔"

۳۔ رجاء بن حیات نے کہا۔ اگر تم کل کے عذاب سے نجات کی تمنا رکھتے ہو تو عام مسلمانوں کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور ان کے لئے وہی چیز ناپسند کرو جو تم اپنے لئے ناپسند رکھتے ہو۔ (پھر اسی حال میں تمہارا خاتمہ ہو جائے کوئی پرواہ نہیں۔

خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فضیل کہتے ہیں "اے ہارون! مجھے اس دن کا بہت ہی ڈر ہے جس دن لوگوں کے قدم پھسل جائیں گے۔ یہ سن کر خلیفہ ہارون الرشید پر رقت طاری ہو گئی اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی"

اس موقع پر فضل بن ربیع نے کہا "امیر المومنین پر رحم کیجئے"۔ فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ تم اور تمہارے ساتھی تو اس کی تباہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں اور تم مجھ سے رحم کی درخواست

کرتے ہو۔" اس کے بعد خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "اے حسین و جمیل چہرے والے تو ہی وہ شخصیت ہے جس سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی مخلوق کے بارے میں بازپرس کرے گا اگر تم اس دن اپنے چہرے کو اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو تو بچالو۔ سنو! کبھی ایسا نہ ہو کہ تم صبح و شام اس حالت میں گذارو کہ تمہارے دل میں اپنی رعایا میں سے کسی کی طرف سے کھوٹ ہو۔ اس لئے کہ نبی اکرم صلعم کا ارشاد ہے جس نے اپنی رعایا سے خیانت کی، ان سے کینہ رکھا وہ جنت کی مہک بھی نہیں پائے گا۔ ہارون الرشید زار و قطار رونے لگا۔ آخر میں اس نے کہا "کیا آپ پر کوئی قرض ہے" فضل نے کہا "ہاں! میرے رب کا مجھ پر قرض ہے۔ جس کا اس نے اب تک حساب نہیں لیا ہے۔ میرے لئے تباہی ہے۔ اگر میرے رب نے مجھ سے پوچھ گچھ کی اور میرے لئے بربادی ہے۔ اگر اس نے مجھ سے بازپرس کی۔ میرے لئے ہلاکت ہے اگر میرے دل میں اس دن کوئی دلیل یا عذر ان کا نہ ہو۔ ہارون الرشید نے کہا "میرا اس سوال سے مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں سے آپ پر کسی کا قرض ہے تو بتائیے۔" فضل نے جواب دیا کہ مجھے میرے رب نے اس کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس کا تو ارشاد ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ -

ترجمہ: میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا مگر عبادت کے لئے۔ میں ان سے رزق کا طالب نہیں ہوں اور نہ میں ان سے چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ وہی رازق ہے، قوی و زبردست۔

ہارون الرشید نے کہا "یہ ہزار دینار ہیں ان کو اپنے اہل و عیال میں خرچ کیجئے اور ان سے عبادت کے لئے اپنے اندر قوت پیدا کیجئے۔" فضل نے کہا "سبحان اللہ! میں آپ کو نجات کا راستہ بتاتا ہوں اور آپ مجھے یہ معاوضہ دے رہے ہیں۔" فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ہم ان کے مکان سے باہر نکلے تو خلیفہ ہارون نے کہا "آئندہ جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس قسم کے عالم کے پاس مجھے لے جانا۔ یہ شخص تو اس دور میں مسلمانوں کا سردار لگ رہا ہے۔" واقعی ایسا شخص مسلمانوں کا سردار نہ ہو تو اور کون ہوگا۔ انہی بزرگ کا قول ہے "اگر علماء دنیا سے بے رغبت ہو جائیں تو بڑے سے بڑے سرکش جبار ان کے قدموں کو چوم لیں۔" یہ وہ شخصیت ہے جس کے پاس خلیفہ وقت نصیحت طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا، روتے ہوئے اس کی باتیں سنیں اور شکر گذار ہو کر ان کے پاس سے اپنے گھر لوٹا۔

۱۳۔ خلیفہ ابو جعفر منصور کے پاس جلیل القدر عالم سفیان ثوری لائے گئے۔ خلیفہ نے ان سے کہا کوئی ضرورت ہو تو پیش کیجئے۔ انہوں نے جواب دیا۔ اتق اللہ (اللہ سے ڈر) تم نے خدا کی زمین کو ظلم و ستم سے بھر دیا ہے۔ خلیفہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر دوبارہ اس نے یہی سوال کیا۔ امام ثوری نے جواب میں کہا کہ تمہیں یہ خلافت کا منصب مہاجرین و انصار کی تلواروں کی طاقت سے ملا ہے آج ان کی اولاد بھوکوں مر رہی ہے اللہ سے ڈر اور ان کے حقوق ادا کر۔ منصور نے پھر سر جھکا لیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر یہی سوال دہرایا۔ کوئی ضرورت ہو تو پیش کیجئے۔ لیکن سفیان ثوری شان بے نیازی کے ساتھ دربار سے نکل آئے اور اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

۱۴۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مکہ مکرمہ کا قصد کرتے ہوئے جب مدینہ منورہ پہنچا تو اس نے وہاں کے جلیل القدر عالم ابو حازم کو بلا بھیجا۔ ابو حازم جب تشریف لائے۔ خلیفہ سلیمان اور ان کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

خلیفہ سلیمان:۔ "کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں"؟

ابو حازم:۔ اس لئے کہ تم نے اپنی آخرت ویران کر دی ہے اور اپنی دنیا آباد کر لی ہے اس لئے تم آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہوتے ہوئے گھبراتے ہو۔

خلیفہ سلیمان:۔ اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کی کیا شکل ہوگی"؟

ابو حازم:۔ "امیر المومنین! نیک کردار والا انسان خدا کے ہاں اس طرح حاضر ہوگا جیسے کوئی مسافر اپنے گھر پہنچتا ہے۔ رہا نافرمان تو اس کی مثال اس بھگوڑے غلام کی سی ہے جو اپنے آقا کی طرف پلٹتا ہے۔" یہ سن کر خلیفہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

خلیفہ سلیمان:۔ کاش میں جانتا کہ خدا کے ہاں میرے لئے کیا طے ہوا ہے۔

ابو حازم:۔ "اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر پیش کیجئے۔ یعنی اپنے اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ لیجئے۔ اس کا ارشاد ہے۔ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بدکردار جہنم میں جلیں گے۔

خلیفہ سلیمان:۔ اللہ کی رحمت کہاں ہے، جواب ملا نیک لوگوں کی صحبت میں۔ اللہ تعالیٰ کے کونسے بندے زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہیں"؟

ابو حازم:۔ نیکی اور تقویٰ والے۔

خلیفہ سلیمان:۔ کونسا عمل افضل ہے؟

ابوحازم :۔ حرام سے بچتے ہوئے فرائض کی پابندی۔

خلیفہ سلیمان :۔ کونسی بات زیادہ قابل سماعت ہے؟

ابوحازم :۔ جس شخص سے تم خوف کھاتے ہو اور امید رکھتے ہو اس کے سامنے حق بات کا اظہار۔

خلیفہ سلیمان :۔ کون سا مسلمان زیادہ خسارے میں ہے؟

ابوحازم :۔ ایسا شخص جو اپنے ظالم بھائی کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت بیچ ڈالتا ہے۔

خلیفہ سلیمان :۔ ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے

ابوحازم :۔ مجھے اس سوال کا جواب دینے سے معاف کیجئے۔

خلیفہ سلیمان :۔ جواب دیجئے اور ضرور دیجئے۔ اس جواب میں بہرحال میرے لئے کوئی نہ کوئی نصیحت پوشیدہ ہوگی۔

ابوحازم :۔ تمہارے آباؤ اجداد نے تلوار کے ذریعے لوگوں پر غلبہ پایا اور مسلمانوں کے مشورے اور خوشنودی کے بغیر ان کے ملک کو جیتا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ تمہارے بزرگ تو چل بسے کاش تم جانتے انھوں نے کیا کچھ کہا اور کیا کچھ ان کے بارے میں کہا گیا۔ اس فیصلہ پر خلیفہ کے ایک ہم نشین نے کہا: "آپ کی یہ بات انتہائی نامناسب ہے۔" ابوحازم نے جواب دیا "اللہ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ حق کو لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کریں گے چھپائیں گے نہیں"

لاہور میں میثاق

مندرجہ ذیل مقامات سے مل سکتا ہے۔!

۱ ماڈل بک سٹال ڈویلپمنٹ مارکیٹ دیال — ۲ پاک بک سٹال ڈویلپمنٹ مارکیٹ دی مال لاہور

۳ ڈیلی موریوا ایجنٹ کمپنی واقع ایم سی دی مال — ۴ کلاسیک بک سٹال ۴۲۔ دی مال

۵ کاشانہ ادب چوک انار کلی کچہری روڈ — ۶ نیشنل بک سٹال چوک لوہاری

۷ ایم اسماعیل اینڈ برادرز بک سٹال چوک لوہاری — ۸ مکتبہ پاکستان چوک لوہاری

۹ ایم شمس الدین تاجر کتب زیر مسلم مسجد — ۱۰ معین نیوز ایجنسی مین بازار کرشن نگر

۱۱ اردستان چوک لکشمی میکلوڈ روڈ — ۱۲ القلم بک سٹال فلیمنگ روڈ

۱۳ شرافت نیوز ایجنسی پرانی انارکلی اور ریلوے کے تمام بک سٹال

مقالات

مولانا عبدالغفار حسن

رمضان المبارک

اور اس کی خصوصیات

رمضان کی خصوصیات

رمضان کا مبارک اور مقدس مہینہ جن خصوصیات اور محاسن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، ان سب کی تفصیل تو اس مضمون میں ناممکن ہے۔ اس موقع پر صرف چند اہم اور نمایاں خصوصیات روزہ، قیام اللیل، اجتماعیت، تلاوت قرآن۔ دعا، انفاق فی سبیل اللہ لیلۃ القدر اور اعتکاف کی تشریح اور تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے نتائج اور ثمرات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے :۔

روزے کے ثمرات

(۱) روزے کا پہلا ثمرہ ایمان کی ازسرنو تازگی اور شادابی ہے۔ اللہ تعالٰی کی صفات خصوصاً اس کے علیم وخبیر اور مالک یوم الدین ہونے پر جس طرح روزہ یقین پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ روزے کی حالت میں بھوک پیاس کی شدت اور جنسی خواہش کے ہیجان پر وہی شخص قابو پا سکتا ہے جو مذکورہ بالا خدائی صفات پر ایمان رکھتا ہو۔ قانون کے ڈنڈے اور پولیس کے پہروں کے بغیر ایک مسلمان اپنے ایمانی تقاضے کی بنا پر ہی اس فرض کو انجام دے سکتا ہے۔ اور یہ چیز اس کی ایمانی قوت وحرارت میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ افراد کی اصلاح کے لئے دو قسم کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ (۱) باطنی یعنی قلبی کیفیات اور اندرونی حالت میں انقلاب و تبدیلی پیدا کی جائے۔ (۲) ظاہری یعنی بیرونی دباؤ اور تعزیری قوانین کے ذریعے برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو نشوونما دینے کی کوشش کی جائے۔

اسلام نے یہ دونوں طریقے اختیار کئے ہیں۔ لیکن اس نے پہلے زیادہ توجہ باطنی اصلاح پر دی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے :۔

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب

بخاری مسلم، مشکوٰۃ

سنو، جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم میں بگاڑ ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ یہ لوتھڑا دل ہے۔

قلبی کیفیات کو بدلنے اور پاکیزہ میلانات کو پیدا کرنے کے لئے نماز کے بعد اگر کسی عبادت کا مقام ہو سکتا ہے تو وہ روزہ ہے۔

(۲) روزے کا دوسرا پہلو اخلاص ہے۔ دوسری عبادات کا علم کسی نہ کسی طرح دوسرے افراد کو ہو سکتا ہے۔ لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جب تک خود روزہ دار ہی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ اس عبادت میں ریاکاری اور نمائش کا کم سے کم امکان پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

الصوم لی وانا اجزی بہ

بخاری مسلم، مشکوٰۃ

روزہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔

(۳) روزے کی بنا پر انسان میں صبر یعنی ضبط نفس اور اپنی خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ھو شھر الصبر۔ مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی۔ یہ بھی واضح رہے کہ اصحاب صبر کے لئے خدا کے ہاں ثواب بھی ان گنت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب

سورہ زمر

صبر والے خدا کے ہاں اپنا اجر بے حساب پائیں گے۔

(۴) روزے کی وجہ سے انسان میں جذبۂ شکر ابھرتا ہے اور خدا کی نعمتوں کی قدر و منزلت اسے معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر یہ جذبہ اپنے محسن حقیقی کی محبت سے وابستہ کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مقام محبت حاصل ہو جائے۔ تو پھر عبادت و اطاعت کی مثالیں بھی دو چند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم ولعلکم تشکرون۔ سورہ بقرہ

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت کی نعمت تمہیں بخشی ہے اس پر تم اس کی بڑائی بیان کرو۔ تاکہ تم (احسانات خدا پر) شکر ادا کرو۔

اسی جذبہ شکر کو ابھارنے کے لئے ایک حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ دنیاوی لحاظ سے ان لوگوں کو دیکھو جو تم سے کم تر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ تم ان نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو گے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی ہیں۔ (بخاری مسلم۔ مشکوٰۃ) روزے کے افطار کے وقت خاص طور پر اس دعا کے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے:۔

اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت ذھب الظماء وابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ تعالیٰ :۔ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ

اے اللہ میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے دیئے ہوئے رزق پر میں نے افطار کیا۔ پیاس بجھ گئی۔ رگیں تر ہو گئیں۔ اور خدا کے ہاں اجر ثابت ہو گیا۔ ان شاء اللہ

اس دعا میں بھی اعتراف نعمت ہے اور جذبہ شکر ابھارنے کی نمایاں طور پر تربیت دی گئی ہے۔

(۵) روزہ انسان میں ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کو ابھارتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جس نے روزے دار کا روزہ افطار کرا دیا۔ تو اس کو بھی روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔ اور جس نے پیٹ بھر کر کسی روزے دار کو کھانا کھلایا۔ اسے اللہ تعالیٰ حوض کوثر کا جام پلائے گا۔ کہ میدان محشر میں پیاس ہی محسوس نہ ہو گی اور جس نے اپنے غلام یا ماتحت شخص سے کام لینے میں نرمی برتی اللہ تعالیٰ اس کی گردن کو جہنم سے آزاد کر دے گا۔ بیہقی، مشکوٰۃ

قیام اللیل

رمضان المبارک کی دوسری خصوصیت رات کا قیام یعنی شب بیداری ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ :۔

بخاری مسلم مشکوٰۃ

جس نے رمضان میں ایمان کی بنا پر اور ثواب کی امید میں قیام اللیل کیا۔ اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

قیام اللیل میں نفس کی تربیت جس طرح ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے:۔

ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ و اقوم قیلا۔ سورۃ مزمل

بلاشبہ رات کا اٹھنا نفس کو کچلنے اور بات کے درست ہونے کے لئے زیادہ سازگار ہے۔

رات کے آخری حصہ میں نرم گرم بستر چھوڑ کر اللہ کی یاد کے لئے اٹھنا نفس پر انتہائی شاق گزرتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اس پر سکون فضا میں اپنے رب سے مناجات اور سرگوشی کرنے میں جو لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا دسواں حصہ بھی دن کے ہنگامہ پرور اوقات میں میسر نہیں آ سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو دوسرے مہینوں کی نسبت رمضان میں شب بیداری کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آخری عشرے میں آپ کی جدوجہد اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے :-

اذا دخل العشر الآخر شدّ مئزرہٗ واحیٰ لیلۃ، وایقظ اھلہٗ -
بخاری مسلم - مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۲/۱

جب (آخری) عشرہ شروع ہوتا۔ تو اپنی کمر کس لیتے۔ رات جاگ کر گزارتے۔ اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔

قرآن کا دور

رمضان المبارک کی تیسری خصوصیت اس ماہ میں نزولِ قرآن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

شھرُ رمضان الذی انزل فیہ القرآن
سورہ بقرہ پ۲

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔

یہ اندازِ بیان ظاہر کرتا ہے کہ رمضان اور قرآن کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رمضان قرآن کی سالگرہ منانے کا مہینہ ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں جبریلؑ کے ساتھ قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے۔ آخری سال آپ نے دوبارہ دور فرمایا۔ صحیح بخاری مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۳/۱

یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کو پوری تیزی کے ساتھ بے سمجھے بوجھے تراویح میں پڑھ لیا جائے گا۔ بلکہ قرآن مجید کا حق صحیح معنیٰ میں اس وقت ادا ہو سکتا ہے جبکہ اس کے نزول کے تین مقاصد پیش نظر رکھے جائیں۔

(۱) لتقرأہ علی الناس علی مکث (سورہ بنی اسرائیل پ۱۵)
ہم نے قرآن کو اتارا ہے تاکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھیں

(۲) کتابٌ انزلناہ الیک مبارکٌ لیدّبّروا آیاتہٖ
ہم نے برکت والی کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔ اور تدبر سے کام لیں۔

(۳) انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ سورہ نساء پ۵
ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو راہ آپ کو دکھائی ہیں۔ اس کے مطابق آپ فیصلہ کریں۔

یعنی انسان اپنے نفس پر، اپنے گھر پر، ماحول پر، پورے ملک پر، بلکہ پوری دنیا پر، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے غلبہ اور حکمرانی کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور معاشرہ کا کوئی حصہ بھی اس کی رہنمائی سے خالی نہ رہے ◆

انفاق فی سبیل اللہ

رمضان المبارک کی چوتھی خصوصیت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے :-

اَطلَقَ کلّ اسیرٍ و اعطیٰ کلّ سائلٍ
بیہقی، مشکوٰۃ صفحہ ۱۷۴/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ تمام قیدیوں کو آزاد فرما دیتے اور ہر سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔

دوسری حدیث میں آپکی سخاوت کو کثرت و زیادتی کے لحاظ سے تیز ہوا (الریح المرسلۃ) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بخاری، مسلم۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۳/۱

اللہ تعالیٰ کے احسانات خصوصاً نعمت قرآن کا شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ کہ اس ماہ میں کثرت سے غربا و مساکین کی مدد کی جائے۔ اور نیک کاموں میں آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ اسی طرح روزے دار اس ماہ میں اپنے دل سے بخل کے میل کچیل کو دور کر سکتا ہے۔ اور اسے سخاوت و فیاضی کا خوگر بنا سکتا ہے۔ ان تمام خصوصیات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے ذریعے عبادتِ خالق اور خدمتِ خلق دونوں کی تربیت دی گئی ہے۔

اجتماعیّت

رمضان المبارک کی پانچویں خصوصیت اس میں اجتماعیت کا پہلو ہے۔ یہ وہ فضیلت ہے جو رمضان المبارک کے تمام احکام و عبادات میں نمایاں ہے۔

روزہ رکھنے کا معاملہ ہر شخص کے صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا۔ تاکہ اس طرح سب مسلمان ایک ہی وقت میں سحری کھائیں اور افطار کریں۔ اس حالت میں اگر کسی کا دل روزے کی طرف راغب نہ بھی ہو۔ تب بھی ماحول اسے مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ روزے کی سعادت سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس اجتماعی حکم کی بنا پر کمزور ایمان والے بھی ایمانی قوت کا سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور عمل صالح کی کھیتوں کو سرسبز و شاداب بنا سکتے ہیں۔

لیلۃ القدر

رمضان کی چھٹی خصوصیت لیلۃ القدر ہے۔ اس رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ سورۃ قدر پ۳۰۔ اس رات کو مندرجہ ذیل دعا پڑھنا مسنون ہے۔

اللّٰھم انک عفوٌّ تحبُّ العفوَ فاعفُ عنّی - ترمذی، مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۲/۱

اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے۔ معافی کو پسند کرتا ہے۔ تو میری خطائیں معاف فرما۔

عام طور پر ستائیسویں شب ہی کو شب قدر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی پانچ طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات شب قدر ہوتی ہے۔ اس لئے ان پانچ راتوں

کو خاص طور پر عبادت وتلاوت اور ذکر الٰہی میں گزارنا چاہیئے۔

اعتکاف رمضان المبارک کی ساتویں خصوصیت اعتکاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آخری سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ صحیح بخاری مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۳

اسلام نے رہبانیت (ترک دنیا) سے منع کیا۔ لیکن انسان کی یہ خواہش بھی فطری ہے۔ کہ وہ یکسوئی کے ساتھ گوشۂ تنہائی میں اپنے رب سے سرگوشیوں میں مصروف ہو اور اس کے حضور میں گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے، اور آئندہ کے لئے از سرِ نو اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان باندھے، اعتکاف کو مستحب قرار دے کر اس خواہش کو پورا کیا گیا ہے۔

دعا رمضان المبارک کی آٹھویں خصوصیت دعا ہے۔ قرآن مجید میں رمضان المبارک کے احکام و فضائل کو بیان کرتے ہوئے درمیان میں دعا کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

وإذا سألك عبادي عني فإني قريب أجيب دعوة الداع إذا دعان فليستجيبوا لي وليؤمنوا بي .... سورۃ البقرہ پ۲۔

یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں۔ (تو ان سے کہہ دو۔ کہ) میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی پکار کو میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، لوگوں کو چاہیئے کہ وہ میری بات مانیں۔ اور مجھ پر ایمان لائیں۔

قرآن مجید کا یہ انداز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ رمضان اور دعا میں انتہائی گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ دعا کی مقبولیت کے بیشتر اوقات اس ماہ میں رکھے گئے ہیں۔

رمضان عبادت کا مقدس، پاکیزہ اور پُر بہار موسم ہے اور دعا کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:۔

الدعاء مخ العبادۃ۔ ترمذی مشکوٰۃ صفحہ ۱۹۴ دعا عبادت کا مغز اور گودا ہے۔

اسی بنا پر روزے دار کی دعا خصوصاً افطار کے وقت اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

رمضان اور دعا میں جو گہری مناسبت ہے، اس کی بنا پر دعا کی اہمیت اور آداب و فضائل کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] دعا کے موضوع پر مولانا کی تحریر ایک مستقل مقالہ ہے جسے انشاء اللہ آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔

(مسلسل)

مقالات

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لئے لکھا ہے جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی اختصار اور کمالِ جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طلبہ کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

راقم الحروف کے لئے پروفیسر صاحب نے اپنے اس خط میں جن نیک جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے وہ ان کا مشکور ہے۔ ساتھ ہی اس تعریف و تحسین پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس کے حق میں پروفیسر صاحب کی نیک دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے اپنے دین کی کسی ادنیٰ خدمت کے لئے قبول فرمالے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ؛

خط کے اختتام پر جو تجویز پروفیسر صاحب نے پیش فرمائی ہے اس کے ضمن میں ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے انہیں یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم سے چند دیرینہ رفقاء نے بالآخر "تنظیم اسلامی" کے نام سے وہی ادارہ قائم کر لیا ہے جسے پروفیسر صاحب نے اپنی اس تحریر میں جمعیۃ دعوۃ وتبلیغ الاسلام کا نام دیا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ جس طرح یہ کٹھن مرحلہ طے پا گیا اسی طرح انشاء اللہ العزیز دوسرا کام یعنی "قرآن اکیڈیمی" کا قیام بھی جلد یا بدیر ضرور سرانجام پائے گا۔ بیدہ التوفیق و علیہ التکلان۔

اسرار احمد

برادرم عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘

میثاق ماہ جون ۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحت "تذکرہ و تبصرہ" سپرد قلم کئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لئے تہ دل سے دعا بھی نکلی۔ آپ نے عصر حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اہل مغرب کا ملحدانہ زاویہ نگاہ، اس زاویہ نگاہ کا اہل مشرق کے ذہنوں پر تسلط، اس کے مضر نتائج، اس ناگوار صورت حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاح حال کی راہ۔ ان مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلا شبہ آپ کی اصابت فکر و رائے، معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ میں آپ کو صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کیلئے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمت دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

میں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوام مشرق کے ذہنوں پر تسلط اور اس تسلط سے رہائی کی صورت — مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائج افکار اور آپ کے نتائج افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشید کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے۔

"موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی" نیز یہ کہ "مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد، لسان العصر اکبرؒ الہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
اکبر رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے"
"رہ وہ ہے جو بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے۔

"لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کے بجائے حیات دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے"

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیت کے الحاد اور انکار خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارس فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکار خدا و روح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادیت کے حامی اور مبلغ ہیں۔ مثلاً

(ا) "THE PHILOSOPLY OF "ASIF" جس کا سب سے پر جوش حامی اور وکیل VAHINGER ہے۔

(ب)	PHENOMENALISM	" " " "	" HUSSREL
(ج)	DIALECTIC MATERIALISM	" " " "	" MARX
(د)	NATURALISM	" " " "	" SANTAYANA
(ه)	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM	" " " "	" J.S. MILL
(و)	EMERGENT EVOLUTION	" " " "	" PLOYD MORGAN
(ز)	ATHEISM	" " " "	" MORRIS COHEN
(ح)	HUMANISM	" " " "	" SCHILLER
(ط)	REALISM	" " " "	" MOORE
(ی)	PRAGMATISM	" " " "	" DEWY
(ک)	LOGICAL EMPIRICISM	" " "	" CARNAP

(ل) EXISTENTIALISM جس کا سب سے پرجوش حامی اور وکیل JEAN P. SARTRE ہے۔
(م) FREUDISM " " " " FREUD "
(ن) BEHAVIOURISM " " " " ADLER "
(س) COMMUNISM " " " " LENIN "
(ع) SOCIALISM " " " " LASKI "
(ف) LOGICAL ATOMISM " " " " RUSSELL "
(ص) PHYSICAL REALISM " " " " SELLARS "

ان تمام مدارس فکر میں قدر مشترک یہ ہے کہ جو شئی حواس خمسہ سے محسوس نہ ہو سکے اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، روح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں اس لئے ان کی ہستی پر یقین خلاف عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

1 - CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE BY DR. DRAPER.
2 - HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPEMENT OF EUROPE BY DR. DRAPER.
3 - HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY BY WHITE.
4 - HISTORY OF EUROPEAN MORALS BY DR. LECKY.
5 - HISTORY OF FREE THOUGHTS IN EUROPE BY ROBERT SON.

تاہم قارئینِ میثاق کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کئے دیتا ہوں۔

(ل) جب JUSTINIAN قیصر روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آکر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلاوطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لئے کلیسائے

روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کریگا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم نے خلافِ عقل عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسبِ ذیل احکام واجب الاذعان بھی نافذ کر دیئے:-

۱۔ معیارِ حق و باطل، بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ، معصوم عن الخطاء اور مطاع ہے اس لئے اس کے احکام میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے

بجا کہے جسے پاپا، اُسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقارۂ خدا سمجھو!

---

[1] مثلاً (ا) تثلیث جس کی رو سے خدا بیک وقت و بیک جہت و بیک حیثیت و بیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسم جس کی رو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے مجسم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا بوجہ غایت فروتنی (HUMILITY) اپنے آپ کو الوہیت سے معریٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

(ہ) جب پادری عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لیکر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی ہے۔ اس ناقابل فہم عمل کو اصطلاح میں TRANSUBSTANTIATION کہتے ہیں اور اردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات۔

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل کی تفسیر لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(د) تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرہویں صدی میں اس کی تمام تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاحِ کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کا معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ERASMUS م ۱۵۳۶ء ZIVINGLI م ۱۵۳۱ء LUTHER م ۱۵۴۶ء MCLANCTHON م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دار و مدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی) بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دار و مدار بائبل پر ہے یعنی معیار حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفہ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترہویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسوی صدی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(ہ) اہل سائنس اور اہل فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلاف عقلی عقائد پر اعتراضات

وارد کئے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں اس لئے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا مثلاً جب کاپرنیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا کہ یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں۔

(و) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکما اور فلاسفہ نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت کا آغاز ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں (HUME) نے لاادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقل انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدون کئے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اسطرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہملٹن اور مشہور عالم الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہن انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ لاادریت سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکما اور فلاسفہ نے نفس مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصف اول میں مشہور جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS ۱۸۰۸-۱۸۷۴) نے ۱۸۳۵ء میں حیات یسوع (LEBAN JESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنیٰ ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرائیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت

کا اندازہ اسبات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر واکر پروفیسر تاریخ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخ کلیسا میں اس کتاب کو "THE MOST EPOCH-MAKING BOOK" "عظیم ترین عہد آفرین کتاب قرار دیا ہے۔

۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیور باخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب THE ESSENCE OF CHRISTIANITY شائع کی جسمیں اُس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصورِ ذات باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیات یسوع (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بور (F. C. BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لئے بائبل بحیثیت مجموعی قابل اعتماد نہیں ہے۔

(سوم) میں نے بخوف طوالت چند نقادوں کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اسبات سے بھی بہت ضعف پہنچا کہ یورپ میں جو فلسفہ۔ اور اس سے میری مراد فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) ہے۔ مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اُس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا اس کی تفصیل یہ ہے انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفہ اشتراکیت کو مسلکِ مادیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈاروِن نے نظریۂ ارتقا پیش کیا جس سے مسلک مادیت کو تقویت حاصل ہوئی شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے۔

مل اور اسپنسر نے مسلک لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نطشہ (NEITZSCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور ANTI-CHRIST

لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSTIVISM) نے مادیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جس کی رو سے خدا، روح اور آخرت جیسے الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مظاہر اور حقیقت (APPEA-RANCE AND REALITY) میں مادیت کی پورے طور سے تردید کر دی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رشیڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے "مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادیت کے مقابلے میں تصوریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی" (ص ۲۲) لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصر حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارسِ فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت جو مادے کے مقابلے میں روح کو اصل کائنات اور حقیقتِ اقصٰی قرار دیتا ہے، غیر مقبول ہو چکا ہے، آج کی دنیا میں حکما اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادیت کی طرف ہے اور مذہب کی اپیل بہت کمزور ہو گئی ہے اور سائنٹفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصر حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں اور سب کے سب الحاد پرور ہیں اور انکار خدا و روح پر مبنی ہیں۔

1 - PLURALISTIC REALISM
2 - DIALECTIC MATERIALISM
3 - EXISTENTIALISM
4 - NATURALISM
5 - LOGICAL POSITIVISM

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصر حاضر | قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیمیافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) سائنٹفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشوونما اور آبیاری۔

(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی

(ج) مادّی علوم و فنون کا عروج

(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصرِ کائنات کا سلسلہ

(ہ) لذاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادّی ہوگیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے[1]۔ خدا سے بے نیازی کی ابتدا تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لئے لاپلاس م ۱۸۲۷ء (LA PLACE) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف "توضیحِ نظامِ کائنات" میں خدا کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے، کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی بخوبی مدوّن ہو سکتا ہے"۔ اور اسی لئے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[2] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی ONTOLOGICAL IDEALISM کے عبیر العلم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متاثر کر رہا ہے۔ خصوصاً ہمارے مدارس فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور ناقابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے اس کے لئے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹفک توجیہہ کی رو سے انسان فاعل مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے

(بقیہ صفحہ ۹۰ پر)

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی ۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

[2] اقبال نے ۱۹۲۵ء میں اپنے استاد کے سوانحِ حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER-SAINT "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

خان محمد - ایم اے (عربی)

مُنفلُوطِی

صاحبِ طرز انشا پرداز ـــ مُصلح افسانہ نگار

منفلوطی صاحبِ طرز انشا پرداز اور مصلح افسانہ نویس کی حیثیت سے جدید عربی ادب کے افق پر نمودار ہوئے اور دورِ حاضر کے مصری ادباء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اگر منفلوطی کے زمانہ اور ان کے ادبی کام کو بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں ایسی ذہنیت کا آدمی کیونکر پیدا ہوگیا اور اسی شان کی ادبی خدمات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا زمانہ ادبی جمود و اضمحلال کا زمانہ تھا۔ عربی فنی نثر قاضی کے ادب کی ایک مسخ شدہ شکل یا ابنِ خلدون کے فن کا ایک بقیہ ڈھانچہ بن کے رہ گئی تھی۔ منفلوطی نے اسے سجع اور قافیہ کی قید و بند اور ثقالت سے پاک کر کے سلیس اور سادہ صورت عطا کی اور ساتھ ہی اس سلاست و روانی اور سہل اندازِ بیان کو استعمال کر کے جدید عربی افسانہ نگاری کے لئے فضا سازگار کی۔

سوانح

سید مصطفیٰ بن محمد لطفی المنفلوطی مصر کے بالائی صوبہ اسیوط کے شہر منفلوط میں ۱۸۷۶ء بمطابق ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے[1]۔ اصلاً نیم ترک اور نیم عرب تھے۔ والد کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے جا ملتا ہے۔ ان کی والدہ چوربجی کے ترکی خاندان سے تھیں۔ ان کا خاندان علم و عرفان اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے نہایت معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے خاندان میں تقریباً دو سو سال سے منفلوط کی شرعی قضا کا عہدہ اور تصوّف کی گدی وراثۃً چلے آرہے تھے منفلوط کے والد سید محمد لطفی بھی اپنے قبیلے کے سردار تھے اور ان کی بہت عزت و تکریم کی جاتی تھی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت منفلوط میں حاصل کی۔ ۱۸۸۶ء میں گیارہ برس کی عمر میں قرآنِ حکیم حفظ کر لیا۔ اس کے بعد قاہرہ چلے گئے اور تکمیلِ تعلیم کی خاطر جامعہ ازہر میں داخلہ لے لیا۔ دس سال تک جامعہ ازہر سے وابستہ رہ کر علومِ لغت و دین میں مہارت حاصل کر لی۔ طبیعت بچپن ہی سے ادب کی طرف مائل تھی۔

[1] دکتور عمر فروخ نے سنِ ولادت اپنی کتاب "ادبعۃ ادباء معاصرون" میں ۱۸۷۵ء دیا ہے اور احمد عبید نے مشاہیر شعراء العصر ج ۱ ص ۳۳ میں ۱۸۷۵ء بتایا ہے۔ لیکن باقی تمام تاریخ نگاروں و تذکرہ نویسوں نے منفلوطی کا سنِ پیدائش ۱۸۷۶ء ہی دیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جب بھی فرصت ملتی عظیم شخصیتوں کے سوانح حیات اور شعر و سخن کی کتابیں پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔ خاندانی روایات ان سے ادب کی بجائے علم دین کی خدمات کی متقاضی تھیں۔ لیکن توسن طبع کو وہ کیونکر ادب سے ہٹا سکتے تھے۔ ادھر ازہر میں بھی کوئی ایسا استاد نہ مل سکا جو ان کے ادبی ذوق کی تشنگی کو بجھا سکتا۔ بلکہ جامعہ کا قانون اس راہ میں ایک سنگین رکاوٹ تھا۔ ادبیات کا مطالعہ ان کے لیے قانوناً ممنوع تھا۔ اساتذہ ادبی کتب کے مطالعہ سے سختی سے منع کرتے تھے۔ لیکن منفلوطی اساتذہ سے آنکھ بچا کر اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر لیتے۔ پکڑے جانے پر سخت سرزنش ہوتی اور بعض اوقات حلقۂ درس سے نکال دیے جاتے۔ لیکن اساتذہ سے جو سزا بھی ملتی منفلوطی اسے کمال صبر سے برداشت کر لیتے۔ مگر ان کے ادبی ذوق و شوق میں اضافہ تو ہوتا رہا لیکن کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔ بلا کے ذہین تھے جو ادب پارہ جی کو بھا جاتا ان کی لوحِ دماغ پر نقش ہو جاتا۔ کتابوں میں سے انہیں "العقد الفرید"، "الاغانی"، "زہر الآداب"، "دواوین متنبی"، "بحتری"، "ابی تمام" اور "شریف الرضی" سے خاص لگاؤ تھا۔ ادباء میں سے عبدالحمید، ابن المقفع، ابن خلدون اور ابن اثیر ان کے نزدیک سب سے افضل ہیں۔ بلند پایہ ادبی کتب کے مطالعہ نے ان کے ذوق سلیم کو جلا بخشی۔ شعر سے فطری لگاؤ اور موزونی طبیعت کی وجہ سے منفلوطی نے سب سے پہلے شعر میں ہی طبع آزمائی کی اور شاعری میں نام پیدا کیا۔ فاضل مصنف ایچ اے آر گیب نے بھی لکھا ہے کہ منفلوطی نے شاعری میں ممتاز مقام حاصل کرنے کے بعد نثر نگاری کا انتخاب کیا۔ گو منفلوطی بلند مرتبت شعراء کے زمرے سے نہیں ہیں تاہم ان کو گھٹیا شعراء کے گروہ میں شامل نہ کرنا اور ان کے منظوم کلام کو گھٹیا قرار دے کر اس سے بے اعتنائی برتنا صریحاً بے انصافی ہے۔

شعر و سخن میں کامیاب طبع آزمائی کے بعد منفلوطی نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں لازوال شہرت حاصل کی۔ بطور نثار ان کی زندگی کا آغاز ازہر ہی سے ہوتا ہے۔ ازہر سے نکلنے کے بعد منفلوطی مفتی محمد عبدہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ مفتی صاحب اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے عالم اور مصلح قوم تھے۔ منفلوطی کو مفتی صاحب سے بہت انس ہو گیا۔ وہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے۔ مفتی صاحب بھی مردم شناس اور ماہر جوہری تھے۔ انہوں نے منفلوطی کو قیمتی جوہر سمجھ کر اپنا مقرب بنا لیا اور انہیں ادب و حیات کے اعلیٰ مقاصد سے آگاہ کیا۔ منفلوطی نے ادب و اخلاق اور حکمت و طبیعات میں کمال حاصل کر کے دینی و اجتماعی اصلاح کا درس مفتی صاحب ہی سے سیکھا۔ دس سال مفتی صاحب سے وابستہ رہ کر کسب فیض کرتے رہے۔

ادباء العرب از بطرس بستانی ص ۳۴۵

BULLETIN OF THE STUDIES OF ORIENTAL SCHOOL - P 316 V5

اور اس عرصہ میں مفتی صاحب کی بلند شخصیت کے اثرات منفلوطی پر اچھی طرح مرتسم ہو گئے چنانچہ مفتی محمد عبدہ سے متاثر ہو کر اور کچھ اپنی حساس طبیعت سے مجبور ہو کر وطن کی سیاسی زبوں حالی دیکھ کر منفلوطی خاموش نہ رہ سکے۔ خدیو عباس کو جب انگریزوں کی طرف مائل دیکھا تو منفلوطی نے اس کی ایک ہجو کہہ کر ایک ہفت روزہ رسالہ میں شائع کرا دی جس پر انہیں عدالت نے چھ ماہ کی قید کا حکم سنایا۔ قید کی سزا پوری کرنے ہی پائے تھے کہ ایک جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے محسن اور عظیم استاد مفتی محمد عبدہ نے ۱۹۰۵ء میں عالم فانی کو خیرباد کہہ کے عالم جاودانی کو جا سدھارا۔ مفتی کی وفات سے منفلوطی دل گرفتہ ہو کر اپنے وطن منفلوط لوٹ گئے۔ وطن میں قیام کے دوران منفلوطی نے ۱۹۰۷ء میں ہفت روزہ "المؤید" میں "اسبوعیات" کے عنوان سے سلسلہ وار مقالات بھیجنا شروع کیے۔ قارئین نے ان کے مقالات کو بہت پسند کیا اور منفلوطی کو جلد ہی نثر نگاری میں ایک بلند مقام حاصل ہو گیا۔ دو سال وطن رہ کر دوبارہ قاہرہ آئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

مفتی محمد عبدہ کے قرب میں رہنے سے سعد زغلول سے بھی ملاقات ہو گئی تھی اور ان دونوں کے طفیل انہیں "المؤید" کے مالک شیخ یوسف علی کی نظر میں بھی بلند مرتبہ مل گیا اور انہی تینوں شخصیتوں نے منفلوطی کی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے انہیں کامیاب ادیب بنا دیا۔ منفلوطی وفد پارٹی میں شامل ہو گئے اور سعد زغلول کی حمایت کرنے لگے۔ جب سعد زغلول وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہوا تو منفلوطی کو وزارت میں سیکرٹری مقرر کر دیا۔ جب سعد وزارتِ عدلیہ میں منتقل ہو گیا تو منفلوطی کو بھی ساتھ لے گیا اور انہیں اقتدار دوئی سے متعلق ایک عہدہ پر فائز کر دیا۔ اس دوران میں روز ویلٹ مصر آیا۔ اس نے ایک تقریر میں کہا کہ اگر انگریز مصر کو چھوڑ کر چلے گئے تو کوئی دوسری قوم مصر پر قبضہ کر لے گی۔ منفلوطی نے اس تقریر کے خلاف رسالہ "المؤید" میں مضمون شائع کروائے۔ اس پر ڈنلوپ نے منفلوطی کو ملازمت سے نکالنا چاہا مگر سعد نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ حکومت کو منفلوطی کی ضرورت ہے نہ کہ منفلوطی کو حکومت کی۔ ۱۹۱۳ء میں پھر منفلوطی کو وزارت عدلیہ کا سیکرٹری ہی بنا دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم سے وزارت میں تغیر و تبدل رونما ہوا تو سعد کے ساتھ منفلوطی کو بھی سیکرٹری شپ کے عہدہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد انہیں "مجلس شیوخ" کا امیر بنا دیا گیا۔ یہ مجلس غیر ملکی تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کرتی تھی۔ منفلوطی تمام شائع ہونے والی کتابوں پر نظر ثانی کرتے اور غلطیوں کی تصحیح کرتے۔ اس کے بعد جب دوبارہ پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا تو منفلوطی کو پارلیمانی سیکرٹری منتخب کر لیا گیا اور ۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء کو اس عہدے پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اخلاق و عادات

منفلوطی خاموش طبع اور دھیمے مزاج کے مالک تھے۔ سنجیدہ اور خلوت پسند تھے۔ ان کے سینہ میں ایک حساس دل تھا۔ انسانیت سوز مظالم دیکھنے یا سننے سے ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ غم زدہ اور آفت رسیدہ انسانوں سے انہیں محبت تھی جو ہاتھ میں ہوتا حقدار لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ ان کی شدت احساس اور نرم دلی کے متعلق بطرس بستانی لکھتا ہے کہ اس کی بیوی کو آشوب چشم کی تکلیف ہوئی جس سے اس کی بینائی جاتی رہی۔ لیکن منفلوطی نے بیوی کے بارے میں کبھی غفلت نہ برتی بلکہ اس کا حال یہ تھا کہ وہ اُسے ایسے ایسے کاموں کے متعلق کہتا تھا جو صرف بینا لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس کا منشا یہ تھا کہ اس کی بیوی کو بینائی کے کھو جانے کا احساس بھی نہ ہو[1]۔

منفلوطی بہت ہی حساس واقع ہوئے تھے۔ ظلم و ستم اور اخلاقی بے راہ روی خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، دیکھ کر غمگین ہو جاتے تھے۔ اسی لئے وہ مجلسوں اور محفلوں سے علیحدہ ہی رہنے کی کوشش کرتے۔ خود ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ پاک دل اور پاک نفس رکھتے تھے۔ غرباء و مساکین اور مصیبت زدہ لوگوں پر خوب سخاوت کرتے تھے۔ مال کے ہرگز حریص نہ تھے۔ اپنے ادب کا کبھی معاوضہ نہ طلب کرتے۔ جب مجبور کئے جاتے تو اپنے مقالات اور قصائد پر بھی بہت کم رقم لیتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو قوم کی دینی و اخلاقی

[1] أدباء العرب صـ ۳۴۶

بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے۔ ۱۔ کسی تاریخ نگار یا تذکرہ نویس نے منفلوطی کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین نہیں کیا۔ سب نے ۱۹۲۴ء سن وفات لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ شوقی نے منفلوطی کا مرثیہ لکھا اور اس کے نیچے حاشیہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ منفلوطی کی وفات اس دن ہوئی جس دن سعد زغلول پر حملہ ہوا۔ طاہر الطناحی نے الهلال دسمبر ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون لکھا ہی لکھا ہے۔ اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مہینہ جولائی ۱۹۲۴ء کا تھا۔ عباس محمود العقاد نے سعد کی تاریخ لکھتے ہوئے لکھی ہے کہ یہ حملہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء کو قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن پر ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منفلوطی کی صحیح تاریخ وفات ۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء ہے۔ ۲۔ آخری عہدے کے متعلق مصنفین میں کچھ اختلاف ہے۔ احمد حسن الزیات کے مطابق آخری عہدہ وزارت عدلیہ کی سیکرٹری شپ ہے۔ ادباء العرب کے مصنف بطرس بستانی نے آخری عہدہ مجلس شیوخ کی امارت بتایا ہے۔ الادب والنصوص کے مصنفین نے لکھا ہے کہ منفلوطی کی وفات پارلیمانی سیکرٹری کے عہدہ پر ہوئی۔ طاہر الطناحی نے بھی الهلال دسمبر ۱۹۲۹ء میں پارلیمانی سیکرٹری شپ کو منفلوطی کا آخری عہدہ بتایا ہے اور الادب والنصوص کے مصنفین سے اتفاق کیا ہے اور یہی درست ہے کیونکہ یہ کتاب بعد کی لکھی ہوئی ہے اور ایک گروہ نے لکھی ہے اس لئے زیادہ تحقیق پر مبنی ہے۔

اصلاح کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان اوصاف حمیدہ کے علاوہ وہ ایک حق گو انسان تھے۔ جھوٹ اور دروغ گوئی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ حق گوئی سے انہیں بڑی سے بڑی سزا بھی باز نہ رکھ سکتی تھی۔ وہ ارباب سیاست سے ان کی دروغ گوئی اور بے ایمانی کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ صرف مفتی محمد عبدہ اور سعد زغلول کو ان معائب سے مبرا خیال کرتے تھے۔ مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہو نالاں تھے۔ تمام اخلاقی برائیوں اور سماجی خرابیوں کی جڑ ان کے نزدیک مغربی تہذیب ہی تھی۔ سچے محب وطن تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر مصر کی حیات ثانیہ میری جان کی قربانی سے مکمل ہو سکتی تو میں موت کو زندگی سے ہزار درجے بہتر سمجھتا۔

تصانیف

جیسے کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ منفلوطی نے سب سے پہلے شاعری میں نام پیدا کیا۔ متعدد اشعار ان کی تصانیف میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ لیکن ان اشعار کو کسی دیوان میں جمع نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی نے ان کو بحیثیت شاعر کے لکھا ہے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد ان کی نثری زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ ابتدا میں ہفت روزہ "المؤید" میں مضامین بھیجتے تھے جو بعد میں "النظرات" کی صورت میں شائع ہوئے۔ منفلوطی کی تصانیف "النظرات"، "العبرات"، "الشاعر"، "ماجدولین"، "الفضیلۃ"، "مختار المنفلوطی"، "فی سبیل التاج"، کا ذکر تو اکثر و بیشتر عرب مصنفین، تاریخ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ لیکن جرمن مستشرق براکلمن نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ دو اور کتابوں "التعزیۃ المصریۃ" اور "کلمات المنفلوطی" کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس طرح تمام کتابوں کی تعداد دس تک پہنچ جاتی ہے۔ بعض مصنفین نے "الانتقام" کو علیحدہ تصنیف شمار کیا ہے کیونکہ یہ علیحدہ بھی شائع ہوئی اور بعض نے اسے النظرات کا ایک حصہ ہی سمجھا کیونکہ اسے بعد میں النظرات میں ہی شامل کر دیا گیا۔ اس لئے دونوں حق بجانب ہیں۔

ان کتب کے علاوہ منفلوطی نے ایک ناول "البعث" بھی لکھا۔ موت سے کچھ عرصہ پہلے شروع کیا۔ اس کتاب میں ابوالعلاء المعری کی کتاب "لزوم مالا یلزم" کی تشریح کی گئی ہے۔ منفلوطی نے ابوالعلاء کی زندگی کے حالات کچھ لکھے اور فوت ہو گئے۔ اس کا کچھ حصہ "النظرات" کی تیسری جلد میں شامل ہے۔

اب ہم ہر کتاب کے محتویات پر بحث کریں گے۔

۱۔ **النظرات** :- تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان سلسلہ وار مضامین، مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ہے جو ہفت روزہ المؤید کو بھیجے گئے اور "الاسبوعیات" کے عنوان سے چھپتے رہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا اپنا لکھا ہوا ایک طویل مقدمہ بھی درج ہے۔ پہلی جلد میں چالیس مقالات ہیں۔ دوسری جلد میں پینتالیس مقالات ہیں۔ دوسری جلد کے شروع میں منفلوطی نے اس جلد کا مقدمہ بھی "البیان" ہی کے عنوان سے لکھا ہے۔ تیسری جلد

ہیں جو تئیس مقالات ہیں۔ اس کی ابتدا میں بھی منفلوطی نے "الجیانی" ہی کے عنوان سے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ پہلی جلد کا مقالہ "رسالۃ الغفران" ابوالعلاء المعری کے رسالہ "الغفران" کا ملخص ہے۔ باقی مقالات طبع زاد ہیں۔ دوسری جلد میں "تابعین فولیتر" ، "وکٹر ہیوگو" (VICTOR HUGO) کے اس خطاب کا ترجمہ ہے جو اس نے ۱۸۷۸ء میں پیرس کانفرنس میں کیا تھا۔ لیکن پابند ترجمہ نہیں ہے بلکہ تھوڑا سا تصرف کیا گیا ہے۔ "سحر البیان" کے عنوان سے منفلوطی نے شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر (SHAKESPEARE'S JULIUS CAESAR) کے ایک منظر کا ملخص پیش کیا ہے۔ "لذعا" کے تحت مقالہ وکٹر ہیوگو کے قصیدہ کا خلاصہ ہے۔ باقی سب مقالات طبع زاد ہیں۔

۲۔ **مقدمۃ النظرات:** النظرات کے مقدمہ میں منفلوطی نے ادب اور اسلوب نگارش پر ایک عمومی بحث کی ہے کہ منفرد اسلوب نگارش کیسے حاصل ہوتا ہے، خاص ادب کسے کہتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے ادب اور اسلوب کے متعلق بھی تحریر کیا ہے کہ انہوں نے اپنا یہ منفرد اسلوب کیونکر حاصل کیا اور ادب کے متعلق ان کے نظریات کیا ہیں اور کن اصولوں کو وہ تحریر کے وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کے اسلوب کی تقلید کرنا بہت قبیح ہے اس سے انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ اسلوب نگارش کسی کی تقلید سے حاصل نہیں کیا بلکہ زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا اور لکھتے وقت وہی پیش کیا جو ان کے ساتھ پیش آیا یا جس کا مشاہدہ کیا۔ کذب بیانی اور تصنع و تکلف سے ہمیشہ احتراز کیا۔ وہ طرز تحریر کو ایک فطری صلاحیت سمجھتے ہیں اور اس کا سرچشمہ دل اور سچائی قرار دیتے ہیں نہ کہ کتب کا مطالعہ اور کسی بڑے ادیب کے انداز تحریر کی اندھی تقلید۔

ادب کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ خاص اور اعلیٰ ادب دل کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اور زندگی کے حقائق کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو ادب کذب و ملمع کاری اور تصنع و تکلف پر ہو وہ گھٹیا اور بازاری ہوتا ہے۔ وہ ادب کی تین اقسام بتاتے ہیں۔ پہلی "حدیث اللسان" ہے۔ اس میں صرف لفاظی ہی ہوتی ہے معانی معدوم ہوتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک گھٹیا ترین قسم ہے۔ دوسری قسم "حدیث العقل" ہے۔ اس میں صرف معانی اور بعید از حقیقت تخیل ہوتا ہے۔ اسے وہ درمیانی درجہ دیتے ہیں۔ سب سے افضل اور اعلیٰ قسم کو "حدیث القلب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس میں تکلف اور جھوٹ و ملمع کاری کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ عام فہم اور حقائق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مقدمہ کے آخیر میں منفلوطی نے اپنے ان اصولوں کو درج کیا ہے جو قلم اٹھاتے وقت وہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل چار اصول ہیں۔

(۱) بغیر کسی تکلف اور تصنع سے لکھنا ہے۔

(۲) کسی کی تعریف و تنقید سے بے خوف ہو کر لکھنا۔

(۳) بعید از حقیقت تخیل سے گریز کرنا۔

(۴) عامۃ الناس کو سامنے رکھ کر لکھنا

اسلوب و ادب کے موضوع پر یہ مفید و دلچسپ بحث اور تحریر کے چار اصول کسی ادیب کے لئے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

۳۔ **العبرات:** یہ طبع زاد اور مترجم افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا افسانہ الیتیم ہے جو طبع زاد ہے۔ اس کے بعد شہیدہ، الحجاب، الذکری، الجزاء، العقاب، الہاویۃ، الضحیۃ اور مذکرات افسانے ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں منفلوطی نے ایک مختصر سا مقدمہ لکھا ہے جو اپنے غایت ایجاز کے باوجود جامع ہے اور مصنف کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساری کتاب کا رنگ اس مختصر سے مقدمہ میں پیش کیا گیا ہے۔ منفلوطی لکھتے ہیں: "دنیا میں بدبخت بہت ہیں اور مجھ ایسے دکھ درد کے مارے کے بس میں نہیں کہ ان کے دکھ درد اور ان کی بدبختی میں سے کچھ بانٹ لے۔ مجھے کم از کم ان کے سامنے آنسو بہانے چاہئیں ہو سکتا ہے جو آنسو میں ان پر بہاؤں وہ ان میں تسلی و تسکین پا سکیں۔"

العبرات "منفلوطی کی شخصیت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ منفلوطی کی طبیعت ملول واقع ہوئی تھی۔ اس کی نظر میں دنیا آنسوؤں کی وادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے وہ بنی آدم کی فطرت کے تاریک پہلوؤں پر نظر جمائے رکھتا ہے۔ اسے دنیا میں یاس و حسرت، حزن و الم اور مصائب و آفات کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ العبرات کے مطالعہ سے THE MAN OF PROPERTY کی GALSWORTHY کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

۳۔ **الانتقام:** اس افسانے میں منفلوطی نے انتقام لینے والی ایک لڑکی کی داستان بیان کی ہے جس نے مصائب و آلام سے تنگ آکر اپنے ظالم سے انتقام لیا لیکن انتقام کے بعد بھی اسے سکون نہ مل سکا۔ بلکہ اس پر حسرت و یاس کی گھناؤنی اداسیاں چھا گئیں اور یہ اداسیاں اس جذبۂ انتقام سے بھی زیادہ تلخ ثابت ہوئیں۔ اس افسانے سے مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انتقام سے عفو و درگزر زیادہ بہتر ہیں۔

۴۔ **الفضیلۃ:** ایک فرانسیسی ڈرامہ کو مصنف نے عربی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے واقعات زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہیں۔ ڈرامے کے اصل مصنف نے یہ ڈرامہ لوگوں کی اجتماعی اور معاشری زندگی کی اصلاح کے لئے لکھا تھا۔ منفلوطی نے شروع میں "اہداء الروایۃ" کے عنوان سے ڈرامہ کو مصری نوجوان عورتوں اور مردوں کے نام منسوب کیا ہے۔ حسین اور دلفریب اسلوب نگارش کی وجہ سے اس ڈرامہ کو عربی ادب میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔

۵۔ ماجد ولین: ماجد ولین ایک فرانسیسی ناول نگار الفونس کار کے ایک ناول کا عربی ترجمہ ہے منفلوطی نے محمد فواد کمال بک کی وساطت سے عربی زبان میں منتقل کیا۔ اس کا اردو ترجمہ حبیب اشعر نے خمنانہ کے نام سے کیا ہے۔

اس کتاب میں منفلوطی نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو شخص دولت کے حصول کے لئے کسی مالدار عورت سے شادی کرتا ہے وہ خاوند نہیں، بلکہ چور اور ڈاکو ہے۔ منفلوطی دولت کی حرص اور تکلفات و تصنعات کی زندگی کو معاشرتی خرابیوں کی اصل بتاتے ہیں۔

اپنے سہل و سادہ اور سلیس و رواں اسلوب اور عمدہ جذبات نگاری کے باعث ماجد ولین کو عربی ادب میں بلند مقام حاصل ہے۔ احمد عبید اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس سے قبل عربی ادب میں اس طرح کی بلاغت اسلوب اور جذبات نگاری کا کوئی ناول موجود نہ تھا۔[1]

۶۔ الشاعر: الشاعر بھی مترجم و ملخص ہے اور کتاب کے سرورق پر اصل فرانسیسی ڈرامہ نگار کا نام بھی دیا ہوا ہے۔ منفلوطی نے الشاعر کا مختصر مقدمہ بھی خود لکھا ہے۔ اس کی کہانی جذبات و صفات انسانی مثلاً شجاعت و بزدلی، مفاخرت، خوبصورتی و بدصورتی، دوستی و دشمنی وغیرہ کا حسین امتزاج ہے۔

۷۔ فی سبیل التاج: یہ بھی ترجمہ ہے۔ اصل زبان میں یہ ایک منظوم ڈرامہ تھا جسے منفلوطی نے تصرفات کر کے افسانے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ منفلوطی نے "الاهداء" کے عنوان سے یہ کتاب سعد زغلول کے نام منسوب کی ہے اور تھوڑا سا اس کا تعارف بھی کرایا ہے۔ حسن شریف نے کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔ حسن شریف نے اصل ڈرامہ نگار شاعر فرانسوا کوپیہ کے حالات اختصار کے ساتھ لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ اصل مصنف نے یہ کتاب ۱۸۹۵ء میں لکھی۔ یہ ایک المیہ منظوم ڈرامہ ہے۔ پھر منفلوطی کے ترجمہ کے متعلق لکھا ہے کہ منفلوطی نے بڑی عمدگی سے اس المیہ کو عربی زبان میں منتقل کیا ہے۔ تصرفات کے باوجود اصل روح کو باقی رکھا ہے اور اس کے اصل اثر کو برقرار رکھا ہے۔

مقصد کتاب کے متعلق حسن شریف رقمطراز ہیں کہ یہ کتاب حب الوطنی کے مقدس جذبہ کو ابھارتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں منفلوطی نے اس کا ترجمہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مصری قوم انگریزی اقتدار کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس طرح ان حالات میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوئی۔

۸۔ مختارات المنفلوطی: یہ کتاب منفلوطی نے سید علی یوسف کے نام گرامی قدر سے منسوب کی ہے۔ یہ کتاب

[1] مشاہیر شعراء العصر

تین جلدوں پر مشتمل تھی لیکن دو جزو شائع نہیں ہو سکے۔ مطبوعہ جزو شائع ہوا ہے جو دو حصوں پر منقسم ہے پہلے حصے کو "باب الفصاحۃ والبیان" کا نام دیا گیا ہے۔ اور دوسرے حصہ کو "باب الادب والحکمۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ اشعار اور نثر کے وہ نمونے پیش کئے گئے ہیں جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ہر شاعر اور نثر نگار کا مختصر سا تعارف اور مشکل الفاظ کے معانی حاشیہ پر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں ادب و حکمت کے جواہر پاروں کو درج کیا گیا ہے۔ اس میں بھی پہلے حصے کی طرح حواشی ہیں۔

مختارات کا مقصد منفلوطی نے خود بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مقصد طلاب کے لئے اظہار خیالات پر دسترس کے حصول کو سہل اور آسان بنانا ہے۔ کیوں کہ یہ نظم و نثر کے بہترین کلام کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کے مطالعہ سے اظہار خیال میں مہارت پیدا ہونا سہل ہو جائے گا۔ منفلوطی کی یہ تالیف اس کے اعلیٰ ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں متقدمین و متاخرین شعراء اور ادباء کے بہترین کلام کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے اور انتخاب کرتے وقت کلام کے صوری اور معنوی ہر دو محاسن کو ملحوظ رکھا ہے صرف ایک قسم کے محاسن کو انتخاب کا معیار نہیں بنایا۔ اس طرح یہ تالیف عربی شاعری اور نثر کے شاہکاروں کا مجموعہ بن گئی۔

منفلوطی کی افسانہ نگاری

جس چیز نے منفلوطی کو جدید عربی ادب میں ایک بلند اور ممتاز مقام پر فائز کیا اور اسے نامور جدید عربی ادباء کی صف میں لا کھڑا کیا وہ افسانہ نگاری ہی ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ عربی افسانہ نگاری کا آغاز سلیم بستانی، نامیب المشعلانی، لبیبہ ہاشم، نقولا حداد، جبران خلیل جبران اور میخائیل وغیرہم کر چکے تھے لیکن جس ادیب نے جدید افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کیا اور صحیح معنی میں عربی ادب کو افسانہ سے روشناس کرایا وہ منفلوطی ہی ہے۔ عربی افسانہ نگاری کے لئے راہ ہموار کرنے کی خدمت منفلوطی نے ہی سرانجام دی۔ زبان کی ثقالت جو عربی افسانہ نگاری کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ تھی دور کر کے راستہ صاف کیا۔ منفلوطی نے کچھ طبع زاد افسانے لکھے اور کچھ دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے۔ منفلوطی چونکہ کوئی یورپی زبان نہ جانتا تھا اور نہ فنی افسانہ نگاری کے قواعد سے آگاہ تھا اس لئے عربی افسانہ کو اس درجۂ کمال تک تو نہ پہنچا سکا جس تک محمود تیمور اور دوسرے افسانہ نویسوں نے پہنچایا، تاہم بعد میں آنے والوں کے لئے راہنمائی کا کام ضرور سرانجام دیا۔ چونکہ

[1] ادباء العرب از بطرس بستانی ص ۳۰۶

عربی افسانہ ابھی ابتدائی مراحل ہی طے نہ کر پایا تھا اس لئے منفلوطی کے افسانوں میں پختگی نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے افسانوں میں بہت سے صوری اور معنوی محاسن پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں اس کے نمایاں محاسن و معائب پر بحث کی جائے گی۔ ——— (جاری)

بقیہ: فکرِ مغرب کی اساس (صفحہ ۸۰ سے آگے)

کہ ارادہ و مشیئت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصور محض خوش فہمی ہے۔" رہے مسائل مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لئے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصے کی توضیح۔ میں نے نہایت اختصار کو مدِ نظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

(جاری)

> پروفیسر صاحب کے اس مضمون کو مکمل ایک ہی بار شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن عین وقت پر مواد زیادہ ہو جانے کے سبب سے اس کے ایک حصے کی اشاعت کو آئندہ ماہ پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے شروع میں جو نوٹ راقم الحروف نے لکھا ہے اس کا آخری حصہ مضمون کے اس جزو سے متعلق ہے جو آئندہ ماہ شائع ہو گا۔ (مدیر)

حقائق و معارف

اظہار احمد قریشی، بہاول پور

آخری منزلِ مراد

خدا کی اس عظیم کائنات میں سب سے زیادہ ظاہر خدا کی صفات ہیں۔ جتنا کچھ ہمارا علم و تجربہ و مشاہدہ وسیع ہو رہا ہے۔ خدا کی عظمت۔ اس کی حکمت۔ اس کی رحمت اور اس کی ان صفات کی جو کتبِ آسمانی میں درج ہیں روز افزوں تصدیق ہو رہی [illegible] آج اس کائنات کے بارے میں جو جو محیر العقول حقیقتیں ہمارے سامنے ہیں اور [illegible] مزید ہمارے علم میں آ رہی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر ہم خدا کی تعریف پہلے سے [illegible] بیان کر سکتے ہیں۔۔

لیکن خدا کی ہستی کے بارے میں ہم آج بھی اتنے ہی لاعلم ہیں جتنے کبھی تھے۔ ہمیں منفی چیزیں معلوم ہیں کہ اس جیسی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ وہ نہ کبھی سوتا ہے نہ تھکتا ہے نہ کبھی پیدا ہوا نہ مرے گا نہ اس کے کوئی اولاد ہے ——— لیکن خدا کیسا ہے؟ کیا ہے؟ ان سوالوں سے ہمیں مذہب نے بھی منع کیا ہے اور کائنات اور خود اپنے بارے میں ہمارا علم بھی ہمیں ان سوالات سے باز رہنے کا ہی مشورہ دیتا ہے۔

یہ کل کائنات ایک بہت بڑا سوال ہے اور خدا کی ہستی اس بہت بڑے سوال کا مکمل جواب ہے۔ انسان کا علم اور مشاہدہ ایک بہت دور کا سفر ہے اور خدا کی ہستی اس سفر کی آخری منزل ہے۔

اس مکمل جواب اور آخری منزل کی صحیح مصوری اور تشبیہ سے ہم قطعاً عاجز ہیں۔ بلکہ ہم تو اس سے کہیں کمتر جوابات اور راہ کی بے شمار منازل کی صحیح مصوری اور تشبیہ سے بھی عاجز ہیں۔

فرض کیجئے کہ کچھ لڑکے کمسنی کے عالم میں انسانی آبادیوں سے دور کسی جزیرے پر پہنچ جاتے

ہیں اور وہاں پلتے اور بڑھتے اور بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور ازدواج کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان میں جو داعیات ابھرتے ہیں۔ عورت سے آشنا ہو کر تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُن کے داعیات کا مکمل جواب ہے لیکن عورت کو دیکھے بغیر وہ ہرگز اپنے داعیات کی بنا پر عورت کی صورت گری نہیں کر سکتے۔

عورت کے دل و دماغ میں اولاد کے لئے اُمنگ ابھرتی ہے۔ اب اگر کہیں اتفاق سے ایسی کسی عورت نے کوئی بچہ نہ دیکھا ہو تو کیا وہ کسی طرز پر کچھ بھی بیان کر سکتی ہے کہ اُسے کیا مطلوب ہے؟ ایک بچہ اس کی گود میں ڈال دیجئے اُس کی سب ضرورتیں پوری اور اس کے تمام ذوق کی تسکین ہو جائے گی۔ اور اس کے سب داعیات کا مکمل جواب مل جائے گا۔ لیکن وہ اس جواب کی صورت گری سے قطعی عاجز ہے۔

انسان حقیقت تلاش کرنے کی عظیم خواہش رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے انسانی نسل کے سپوت جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ تو کیا ہم اس حقیقتِ کل تک نہ پہنچیں گے؟ یا نہیں پہنچ سکتے؟

اس سوال کے جواب میں کتب آسمانی میں ہمارے لئے بشارت ہے کہ ہم اس حقیقتِ کل تک ضرور پہنچ سکتے ہیں اور ہم اپنی اُمنگوں کی اُس آخری منزلِ مراد اور اپنے اس مطلوبِ ازل کو پا سکتے ہیں۔

ہمارے اس سفرِ زندگی کا مقصود دراصل خدا کی صفات کی معرفت ہے۔ مذہبی تعلیمات اور ہمارے مادی علم و ہنر کا ارتقاء دونوں ہمیں اس مقصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں ——

نوعِ انسانی کے اس سفرِ زندگی کے اختتام کے بعد جب دوبارہ سب انسان اکٹھے ہوں گے اس وقت تک خدا کی صفات جتنی ظاہر ہو چکی ہوں گی ان کی بنا پر خدا کی مزید حمد و ثنا ممکن ہوگی۔ چنانچہ اس کیفیت کے بارے میں حضور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے روز میں خدا کی جو حمد بیان کروں گا وہ آج نہیں کر سکتا۔"

اگلے عالم میں ہمیں اس زندگی کے نیک اعمال کے صلے میں جنت میں داخلہ ملے گا یا بداعمالی کی بنا پر دوزخ کی آگ سے واسطہ پڑے گا۔

جنت میں ہمیں عیش و آرام ملے گا۔ ہماری ہر خواہش پوری کی جائے گی اور ہم جو مانگیں گے ہم کو دیا جائے گا ——— غور کیجئے کہ کیسی جگہ ہوگی۔ ہم اس دنیا میں کیسی کیسی تمنائیں مجبوراً سینوں میں دبائے پھرتے ہیں، جنت میں نہ صرف یہ کہ یہ سب کی سب بلکہ اس وقت تک جو اور تمنائیں یا امنگیں پیدا ہوں گی وہ سب بھی پوری کر دی جائیں گی!!

ہماری ہر خواہش پوری کرنے کے بعد خدا فرمائے گا کہ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت خود خدا سامنے آئے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ ہم جو زیادہ سے زیادہ خواہش کر سکتے تھے اس سے زیادہ ہمیں مل جائے گا جس بڑی سے بڑی تسکین کا ہم تصور کر سکتے تھے۔ اس سے زیادہ تسکین ہم کو حاصل ہو جائے گی۔ ہم اپنے آخری مقصود کو پالیں گے۔!!

خدا کو مقصد بنا کر اس زندگی کا سفر کیجئے۔ اسی کو اپنی منزل سمجھئے اور اپنی راہ کھوٹی نہ کیجئے ——— !!

ہم سے طلب فرمایئے

تصانیف: مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر آیت بسم اللہ ۔ وسورۂ فاتحہ

بڑا سائز، صفحات ۲۶۰ ہدیہ: ۷۵ پیسے

★ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار
صفحات: ۳۱۲، قیمت ۲٫۷۵ روپے

★ تزکیہ نفس
صفحات: ۳۴۴، قیمت ۶٫۰۰ روپے

★ اسلامی قانون کی تدوین
صفحات ۱۶۰ قیمت ۳ روپے، سستا ایڈیشن ۲ روپے

عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ
صفحات ۱۲۸، قیمت ۲٫۲۵ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ کرشن نگر لاہور

ہم سے طلب فرمائیے!

تصانیف مولانا فراہی رح

تفاسیر

مقدمہ تفسیر نظام القرآن	قیمت	0.90 روپے	
تفسیر بسم اللہ و سورۃ فاتحہ	"	0.45	"
" سورہ قیامہ	"	0.60	"
" " والشمس	"	0.50	"
" " فیل		1.00	"
" " ذاریات		1.30	"
" " مرسلات		0.60	"
" " والتین		0.70	"
" " کوثر		1.10	"
" " لہب		0.70	"
" " تحریم		0.70	"
" " عبس		0.70	"
" " والعصر		0.60	"
" " کافرون		0.45	"
" " اخلاص		0.45	"
اقسام القرآن		1.30	"
ذبیح کون ہے؟		1.70	"

لغت و ادب

★

اسباق النحو

حصہ اول : 1.40 روپے

" دوم : 1.00 "

★

امثال آصف الحکیم

قیمت : 1.37 روپے

★

جمہرۃ البلاغہ

قیمت : 1.50 روپے

★

مفردات القرآن

قیمت : 1.40 روپے

★

دیوان (عربی)

قیمت : 1.50 روپے

★

نوائے پہلوی (دیوان فارسی)

قیمت : 3.00 روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ ـ کرشن نگر لاہور

افکار و آراء

خذلانِ الٰہی[1] اور اس کا علاج

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، مدیر الفرقان لکھنؤ

"اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شکست کو اب چند دن میں پورے پانچ مہینے ہو جائیں گے۔ لیکن اس شکست کے وہ آثار و نشان جو ۵ سے ۹ جون تک وجود میں آگئے تھے۔ نہ صرف سب کے سب قائم ہیں بلکہ ان میں کچھ اضافے بھی ہو رہے ہیں۔ اکتوبر کا آخری عشرہ شروع ہونے پر مصر نے اسرائیل کا ایک تباہ کن جہاز اپنے ساحل کی خلاف ورزی پر ڈبو دیا۔ اسرائیل نے اس پر اعلان کیا کہ وہ اس کا بدلہ لے گا اور چوتھے دن اس نے یہ بدلہ اس طرح لے لیا کہ مصر کے دو اہم کارخانوں کو اپنی گولہ باری اور بمباری کا نشانہ بنا کر ایک کو بالکل اور دوسرے کو تقریباً تباہ کر دیا۔ مکمل تباہ ہو جانے والے تیل صاف کرنے والے کارخانے کی اتنی اہمیت تھی کہ مصر کی روزانی معیشت کا اس پر انحصار تھا۔ مصر کو اندیشہ تھا کہ بدلہ کی کارروائی کے لئے اسرائیل ان کارخانوں کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ چنانچہ مصری ذرائع نے بعد میں بتایا کہ وہ اس خطرہ کی بنا پر تین دن پیشتر سے اس کا تیل منتقل کر رہے تھے لیکن نہ صرف یہ کہ مصر بدلہ کی دھمکی پر کوئی جوابی دھمکی نہیں دے سکا کہ اسرائیل کو پس و پیش ہوتا بلکہ کوئی مؤثر مدافعت بھی نہیں کر سکا۔ اسرائیل کی جرأت کا یہ حال رہا کہ اس نے آگ بجھانے والوں کا بھی ناطقہ تنگ رکھا۔ اس کے ہوائی جہاز ان لوگوں کے سروں پر بھی پہنچ کر فائرنگ کرتے رہے اور ڈھائی دن کی لگاتار کوشش سے یہ آگ بجھائی جا سکی۔"

"یہ انتقامی حملہ اسرائیل کا ایک نیا چیلنج تھا جسے عربوں نے مکمل سکوت کے ساتھ برداشت کیا اور ایک نئی ضرب اسرائیل کے ہاتھوں کھا کر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ ساڑھے چار مہینے مل جانے پر بھی اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ اسرائیل کا فاتحانہ نشہ کم کر سکیں۔ اسرائیل کی بساط دیکھئے اور اس کے حوصلے اور عربوں کا طول و عرض دیکھئے اور ان کی بیچارگی! یہ اگر اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ[2] کا معاملہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

"اللہ کے یہاں اس معاملہ کی نوعیت کیا ہے اس کا قطعی علم صرف اسی کو ہے لیکن اسے ماننے والوں کی سعادت یہ ہے کہ خذلانِ الٰہی کا وہم بھی ہو تو اسے اہمیت دیں جبکہ یہاں ہر وہ علامت جو خذلان کی بتائی جا سکتی ہے موجود ہے اور وہ بنیادیں بھی موجود ہیں جن کے بعد خذلان نہ ہو تو یہ اللہ کا کرم نہیں اس کی ڈھیل ہوگی۔"

---

[1] عنوان کی ذمہ داری مدیر میثاق پر ہے۔ [2] اگر اللہ تمہیں بے سہارا کر دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے؟ (قرآن)

"بہرحال جس شکست میں خذلانِ الٰہی کے آثار ہوں اس کا کوئی مداوا اس کے سوا نہیں کہ اسبابِ خذلان کو دور کیا جائے۔ عرب قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر جس طرح نبوتِ محمدی کے نقوش کو اس سرزمین اسلام پر دھندلا کرنے کی کوشش کی گئی اور آج کے قومی لیڈروں کو صاف صاف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑھانے کی چھوٹ بر زبان دراز کو ملی رہی جب تک ان چیزوں کو کچلنے والی قیادت عربوں میں برسرِ اقتدار نہیں آجائے گی اس شکست و ذلت کے آثار مٹ نہیں سکتے۔ ہم میں سے کسی کے نزدیک یہ باتیں یہودی غلبہ سے کم تر ہو سکتی ہیں۔ مگر کوئی دلیل نہیں ملتی جس سے ہم سمجھیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہ باتیں یہودی غلبہ سے کم تر ہیں۔ خود یہود کی مثال موجود ہے کہ اپنے نبیوں کی شان میں ان کی گستاخیوں پر جب گرفت ہوئی تو ان سے بدتر جابر تر قومیں ان پر مسلط کی گئیں اور اس کی بھی پروا نہیں کی گئی کہ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا۔ (سورۃ اسراء رکوع ۱)۔ (وہ داخل ہوں مسجد (بیت المقدس) میں جیسا کہ پہلی بار داخل ہوئے تھے۔ اور برباد کر دیں ہر اس چیز کو جس پر وہ غلبہ پائیں) ۔۔ عالمِ اسلام کے مسلمان جو اس شکست و ذلت پر بے چین ہیں، وہ بھی عربوں کی اگر کوئی واقعی مدد کر سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ وہاں اس تبدیلی کے لئے کوئی جدوجہد کر سکتے ہوں تو کریں۔"

"علی گڑھ مرحوم" | مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ مدیر "صدق جدید" لکھنؤ

"نوشتۂ تقدیر آخر سپریم کورٹ کے فیصلہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور مسلمانوں کے قلب پر بجلی گر کے رہی، ملک کی سب سے بڑی عدالت کا فیصلہ اور وہ بھی متفقہ اجلاس میں صادر ہو کر رہا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی نہیں حکومت ہند کی قائم کی ہوئی ہے اور اس کے نظم و نسق کے پورے اختیارات مسلمانوں کو نہیں سرکارِ ہند کو حاصل ہیں۔

چند روز قبل کوئی مسلمان اس کا تصور بھی کر سکتا تھا؟

خواب یہ دیکھے جا رہے تھے کہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۵ء کے ایکٹوں میں جو شدید ناانصافیاں اور حق تلفیاں اس بدنصیب ملت کے ساتھ ہوئی ہیں ان کی داد رسی ہوگی۔ ان کی تلافی کی کوئی صورت نکلے گی۔ اکثریت جو ایک عزیز ترین متاعِ ملت پر قابض ہوتی جا رہی ہے، بلکہ ایک حد تک قابض ہو چکی ہے اس سے نجات ملے گی اور مسلمانوں کا قبضہ اپنے سے ایک چھنی ہوئی چیز پر بحال ہو گا۔ تعبیر بالکل برعکس نکلی اور آرزوؤں اور امیدوں تمناؤں کا سارا طلسم دم بھر میں ہست سے نیست ہو کر رہ گیا۔ سزا ہے ایک تمام تر گراں خواب اور یکسر خود فراموش قوم کی!

قانونی چارہ جوئی کے لئے ممکن ہے کہ اب بھی کوئی نقطہ رس دماغ کوئی نکتہ پیدا کرے۔ لیکن بظاہر تو ہم عامیوں کو ہر دنیوی دروازہ تفکر و تدبیر کا بند ہی نظر آتا ہے ۔۔۔ اپنی زندگی میں تو اس نوعیت کا یہ تیسرا اہم صدمہ ہے جو ملت کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ پہلا صدمہ ۱۹۲۴ء میں منصبِ خلافتِ اسلامیہ کی موقوفی سے اٹھانا پڑا تھا اور تیرہ سو سال کے

اس مقدس منصب کے فنا سے اس وقت کا عالمِ اسلامی تھرا اٹھا تھا۔ دوسرا صدمہ اس قسم کا ستمبر ۱۹۴۸ء میں مسلم سلطنتِ آصفیہ کے مٹ جانے سے پہنچا تھا اور تیسرا صدمہ اسی نوعیت کا یہ علی گڑھ کی رحلت ہے۔ علی گڑھ اپنے جغرافیائی نام کے اعتبار سے اب بھی زندہ رہے گا لیکن مسلم علی گڑھ تو بہرحال اب مرحوم و مغفور ہو چکا ہے۔ یونیورسٹیاں اب بھی ملک میں درجنوں کی تعداد میں قائم ہیں۔ بس انہی میں ایک علی گڑھ کا بھی شمار ہو گا لیکن جو علی گڑھ مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا اور ملت کا ملجا اور ماویٰ تھا وہ تو اب رخصت ہو ہی چکا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۶ء تک مدت کل ڈیڑھ سال کی ہوئی۔ بس اتنی ہی عمر لکھا کر لایا تھا۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ۔ جو حکیم مطلق آزمائشیں کرتا اور جری کرتا رہتا ہے وہی ان وقتوں کے کاٹنے کی بھی قوت برداشت دے دیتا ہے۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز!"

"جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہندو گردی کی نذر" | مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری۔ مدیر "انوار الاسلام" بنارس

"ملک کی آزادی سے پہلے مسلمانوں کی تین یونیورسٹیاں تھیں، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، وہ ملک کے آزاد ہوتے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعلق حکومت نے اپنی اکثریتی طاقت سے حسبِ خواہ قانون بنا کر اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ مسلمانوں نے بڑے اعتماد سے سپریم کورٹ میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے دعویٰ کیا۔ مگر اس نے بھی حال ہی میں اپنا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف صادر کر دیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھی ہندو گردی کی نذر ہو گئی۔ آل انڈیا جن سنگھ کے صدر بلراج مدھوک کو گذشتہ الیکشن میں جامعہ ملیہ کے حلقے سے ووٹ نہیں ملے تھے۔ اس کا انتقام لینے کا انہوں نے الیکشن کے بعد ہی اعلان کر دیا تھا۔ ان کی خوش قسمتی اور مسلمانوں کی بدبختی سے جامعہ کے سربراہوں اور کارفرماؤں کی سیکولرزم پرستی نے خود جامعہ کا ماحول بلراج مدھوک جیسے لوگوں کے لئے سازگار بنا دیا تھا یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہندو طلبہ کی تعداد اسی فیصدی تک پہنچ گئی ہے۔ طلبہ کی اسی اکثریتی طاقت کی بنا پر بلراج مدھوک نے ہندو طلبہ سے ایک میمورنڈم پیش کروا دیا تھا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ جامعہ میں قومی ترانہ نہیں گایا جاتا۔ ۸۰ فی صدی ہندو طلبہ کے ہوتے ہوئے بھی اتوار کی تعطیل جمعہ کو ہوتی ہے اور جلسوں کا افتتاح قرآن مجید سے ہوتا ہے۔ جامعہ کے بے حمیت کارفرماؤں نے اس میمورنڈم کے مطابق ایک سرکلر جاری کر دیا کہ آئندہ جمعہ کے بجائے اتوار کو ہی تعطیل ہوا کرے گی اور آئندہ کسی تقریب یا جلسہ کا افتتاح قرآن مجید سے نہ ہو گا۔

ہم نہیں سمجھتے کہ جامعہ کے کارفرماؤں کو جامعہ کے اسلامی کردار کے ہٹانے کا کیا حق تھا؟ کیا جامعہ انہوں نے قائم کی ہے؟ مسلمانوں کو ان سے جواب طلب کرنا چاہئے۔"

ایک نیا اصلاحی ادارہ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مدیر صدقِ جدید، لکھنؤ

"لاہور کے معزز دینی ماہنامہ 'میثاق' سے یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم و بصیرت مخلصوں کی سعی و اہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعتِ اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے۔ جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

"جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لئے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔"

یہ صدق کے مسلک کی صدفی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ "ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا اور اس مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی ان کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے اور نہ اسلام کی رو سے یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے۔"

اور پاکستان کی (ہندوستان کی نہیں) جماعتِ اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔ اللہ ہم سب کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہِ اصلاح و ہدایت پر مستقیم رکھے۔"

مشرقی پاکستان میں میثاق کی ایجنسیاں

۱۔ ظفر اینڈ کمپنی۔ ۲۔ نواب پور روڈ۔ ڈھاکہ۔

۲۔ ایس۔ ایم الیاس، ۵۔ ایم۔ اے جناح روڈ، چٹاگانگ۔

کراچی میں میثاق کی ایجنسیاں

۱۔ طاہر بک ڈپو، ٹرام جنکشن، صدر کراچی۔

۲۔ عوامی کتب خانہ، ترو بولشن مارکیٹ کراچی۔ ۲

خطوط و نکات

۱۔ تاریخِ اسلامی کا دورِ فتن

اور

مولانا امین احسن اصلاحی

['میثاق' کے گذشتہ شمارے میں ایک تو 'تبصرہ محمودی بر خطوطِ مودودی' کی جلد دوم پر تبصرہ شائع ہوا، دوسرے حکیم محمود احمد ظفر صاحب کی تالیف 'سیدنا معاویہؓ' پر تبصرے کے ضمن میں اس کتاب کا وہ مقدمہ شائع ہوا جو مولانا امین احسن اصلاحی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس پر ہمارے ایک محترم دوست نے مولانا اصلاحی کی تصانیف سے بعض ایسی تحریروں کے حوالے راقم الحروف کو ارسال کئے جن سے حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ اور دورِ بنو امیہ کے بارے میں کچھ وہی نقطہ نظر مترشح ہوتا ہے جو عوام کا ہے اور جسے اس کی منطقی انتہا تک صاحبِ 'خلافت و ملوکیت' نے پہنچایا ہے۔ اس کے جواب میں جو وضاحتی مکتوب مولانا نے تحریر فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ اعترافِ تقصیر کی ایک نہایت درخشاں مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو اس کی جزا عطا فرمائے، اور دوسروں کو بھی اس کی توفیق دے کہ وہ اب جبکہ ہماری تاریخ کے دورِ فتن کے بارے میں بعض ایسے حقائق منظرِ عام پر آگئے ہیں جو بہت سے تاریخی و مذہبی عوامل کی بنا پر عوام ہی نہیں بعض خواص تک کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے تھے تو محض ضد اور پندارِ نفس کی بنا پر غلط نظریات پر نہ اڑے رہیں۔ ——— (اسرار احمد)]

رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

مکرمی و محبی زاد لطفہ،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ڈاکٹر صاحب سلمہٗ کے نام آپ نے جو خط میرے بعض خیالات سے متعلق لکھا ہے وہ میں نے پڑھا۔ میں آپ کی اس تنبیہ کے لئے دل سے شکر گذار ہوں۔ میں پوری صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں تاریخ کا طالبِ علم کبھی نہیں رہا۔ میں ابتدا سے قرآن کا طالبِ علم رہا ہوں اس وجہ سے تنقید کے ساتھ میں نے تاریخ کا صرف وہی حصہ پڑھا ہے جو براہ راست قرآن سے متعلق ہے مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق واقعات جب میں پڑھتا تھا تو مجھے ان سے الجھن تو ہوتی تھی لیکن اپنا فن نہ ہونے کے سبب

سے میں نے ان کی تحقیق پر کبھی وقت صرف نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی کبھی عام تاریخی روایات کے زیر اثر میرے قلم سے بھی وہی باتیں نکل گئیں ہیں جو تمام تر جھوٹ اور افترا ہیں۔ اس میں فی الواقع میں محمود عباسی صاحب کا بڑا ممنون ہوں کہ ان کی تحقیقات سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ میں آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ ان کی کتابیں ضرور پڑھیے۔ علم کے معاملے میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ اب سے بہت پہلے میں محمود عباسی صاحب کی کتاب پر تقریظ اور حکیم محمود صاحب کی کتاب پر تعارف لکھ کر بالواسطہ گویا یہ اعلان کر چکا ہوں کہ اس دور کی تاریخ سے متعلق میں اسی نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتا ہوں جس کی طرف ان فاضل مصنفوں نے رہنمائی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ اگر خود میری کتابوں میں بھی کوئی بات سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا امیر معاویہؓ کے متعلق ایسی نکل گئی ہے جو تحقیق سے جھوٹی ثابت ہوگئی ہے تو میں نے اس سے رجوع کر لیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہے کہ ان صحابہؓ کا دامن ان الزامات سے پاک نکلا جن میں سبائیوں نے ان کو ملوث کیا تھا۔ اگر میں تاریخ کا طالب علم ہوتا تو میں بھی اس سلسلے میں کچھ کام کرتا۔ لیکن یہ میرا فن نہیں اس وجہ سے میں ان لوگوں کے لئے دعا کرتا ہوں جو سبائی خرافات سے ہماری تاریخ کو صاف کر رہے ہیں۔

آپ نے میری جن کتابوں کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ان کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو میں لازماً ان پر نظر ثانی کر کے ان کی اصلاح کر دوں گا اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں اس تنبیہ کے لئے آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دعاگو

امین احسن اصلاحی''

۲- فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور

اس کی فتنہ سامانی!

[ذیل میں مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کے ایک خط کا اقتباس درج کیا جا رہا ہے جو موصوف نے مولانا امین احسن اصلاحی کے نام تحریر فرمایا ہے۔ — مدیر]

''...... تازہ 'میثاق' میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحبِ صدق نے بھی خیر مقدم کیا ہے۔ اس کی تفصیلات معلوم ہوگئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ صدق نے داد دی ہے میں بھی اسے ہی سب سے زیادہ قابل داد اور آبِ زر کیا آبِ جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین

خمیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحب دعوت و عزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں بس وہی "حزب اللہ" بن جاتے ہیں اور قواعد و ضوابط اور کثرت رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، تبھی تک خیریت رہتی ہے باقی جہاں اکثریت و اقلیت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر و سکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوئے بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت خود مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلہ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص و للہیت کم و بیش تمام افراد جماعت میں نہ ہوں جماعتی عصبیت و رقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے مجھے تو ہمیشہ الٰہ آباد کے عارف اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے۔ جس کے ذریعے اس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرمایا تھا۔

کریما ببخشائے بر حال بندہ — کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ ...... اور ...... کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ ان میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہیں ہوا' ...... میں جب آخر تک کوئی صدارت کی کوشش ہونے پر راضی نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!

۳- مریدِ فرنگ

(انصار احمد۔ ایم۔ اے (فلسفہ))

[عزیزم انصار احمد سلمہٗ جن کے خطوط سے بعض اقتباسات درج ذیل کیے جا رہے ہیں، راقم الحروف کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ قارئین 'میثاق' کو یاد ہوگا کہ میں نے منٹگمری (حال ساہیوال) میں ایک ہاسٹل قائم کیا تھا جو سن ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک تین سال قائم رہا۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کالجوں میں زیر تعلیم طلبہ کو ایک ہاسٹل میں رکھ کر ایک طرف انہیں عربی، قرآن اور حدیث کی تعلیم دی جائے اور دوسری طرف ان کی دینی تربیت کی کوشش کی جائے چنانچہ اسی کام کے لئے دو سال مولانا عبدالغفار حسن بھی ہاسٹل کے نگران و مربی کی حیثیت سے وہاں مقیم رہے —— عزیز انصار احمد سلمہٗ بھی تین سال اس ہاسٹل میں رہے

انہیں میں بعض دینی خانقاہی مولویات کے خلاف کالج میں آرٹس کے مضامین لے کر دیئے اور ان میں بھی فلسفہ کو ان کا موضوع خاص بنایا۔ دلی تمنا تھی کہ آں عزیز فکر جدید و قدیم سے اچھی طرح واقف ہو کر فکر اسلامی کو مدلل و دلنشین انداز میں پیش کرنے کے قابل ہوں ۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ آنعزیز کو ایک طرف فلسفے سے شغف بڑھتا چلا گیا اور دوسری طرف ان کے ذوق دینی میں بھی اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں آنعزیز نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (فلسفہ) کا امتحان امتیازی شان کے ساتھ پاس کیا اور وہ نہ صرف اپنے شعبے بلکہ پوری فیکلٹی میں اوّل آئے۔ اس کے بعد راقم الحروف کے مشورے پر انہوں نے ایم اے (نفسیات) کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اور اس کا ایک سال مکمل بھی کر لیا تھا کہ اچانک حکومت پاکستان کی جانب سے فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ پر انگلستان جانے کا حکم آ گیا ۔۔۔ چنانچہ اب آں عزیز انگلستان کی ریڈنگ یونیورسٹی میں فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

راقم الحروف نے جاتے ہوئے بھی انہیں نصیحت کی تھی اور پھر خطوط میں اس کا اعادہ کیا کہ ایک تو قرآن حکیم کی تلاوت مع تذکر اور مطالعہ مع تدبر بسلسل کرتے رہیں (خوش قسمتی سے ان کی روانگی سے قبل تدبر قرآن کی جلد اوّل کا ایک نسخہ جلد کی تکمیل کے بغیر مل گیا تھا جسے وہ ساتھ لے گئے ہیں) دوسرے نماز کا پورا التزام کریں، تیسرے داڑھی کی حفاظت کریں، چوتھے علامہ اقبال کے خطبات زیر مطالعہ رکھیں، اور پانچویں جدید ملحدانہ فکر کے مقابلے میں نفس مذہب کے دفاع کے لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تصانیف سے بھی استفادہ کریں۔

آنعزیز کے خطوط ایک طرف ان کے دینی جذبات کے آئینہ دار ہیں اور دوسری طرف ان کے فکری رجحانات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ تیسرے ان میں انگلستان کے حالات کے بارے میں عمومی دلچسپی کی معلومات بھی ہوتی ہیں۔ انہی تینوں چیزوں کے پیش نظر ان کے بعض اقتباسات حاضر خدمت ہیں۔

راقم الحروف قارئین میثاق سے استدعا کرتا ہے کہ وہ آں عزیز کی ہدایت و استقامت کے لئے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم صحیح اور عمل صالح سے حصہ وافر عطا فرمائے۔ اور انہیں اپنے دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہی اس علمی و فکری انقلاب کے کام کا نقطہ آغاز بنا دے جس کے بارے میں راقم الحروف تفصیل کے ساتھ لکھتا رہا ہے۔ ―――――― (اسرار احمد)]

لندن، ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء

"کل بعد دوپہر ریڈنگ گیا۔ بس کا سفر خاصا طویل ہوتا ہے اس لئے ٹیکسی سے پیڈنگٹن سٹیشن جا کر ٹرین پکڑی یہ صرف پینتیس چالیس منٹ لیتی ہے۔ وہاں پہنچ کر سیدھا یونیورسٹی کا رخ کیا۔ خاصی تگ و دو کے بعد فیکلٹی آف لیٹرز میں شعبہ فلسفہ کو تلاش کیا۔ دو تین پروفیسر حضرات موجود تھے۔ ڈاکٹر پارکنسن نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ ساتھ ہی میری رہائش وغیرہ کے انتظام کے لئے یونیورسٹی کے افسر رہائش کو فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جمعہ کے روز ساڑھے دس بجے صبح کا ٹائم دیا ہے۔ ریسرچ کے مضمون کے بارے میں سوچنے کو کہا ہے۔

شام کو لندن واپس آنے کے لئے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب ملے جو باریش تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پاکستان کے ہیں۔ اور یہاں پر محکمہ موسمیات میں ملازم ہیں۔ نماز عصر کا وقت تھا گھر لے گئے وہاں نماز ادا کی کچھ دیر بعد مجھے پاکستانیوں کے گھروں میں لے گئے۔

ریڈنگ میں شعبہ فلسفہ میں میرے ایک دوست ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں ان سے ابھی تک ملنا نہیں ہو سکا۔ وہ بھی میری خاصی مدد کر سکتے ہیں۔ بالخصوص شعبہ کی روایات اور کارکردگی کے بارے میں تو انہی سے معلوم ہو گا۔

آج صبح نماز سے فارغ ہو کر "تدبر قرآن" کا مطالعہ کیا۔ مقدمہ تقریباً پورا پڑھ لیا ہے۔ انشاءاللہ باقاعدہ مطالعہ جاری رکھوں گا آپ میرے لئے دعا کرتے رہا کیجئے۔

سردی یہاں پر ابھی زیادہ نہیں۔ پھر بھی پاکستان کی دسمبر جنوری جیسی ہے۔ شام اور صبح کو اوور کوٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ دکانیں اور تمام عمارات بجلی سے گرم ہوتی ہیں۔ چنانچہ سردی کا بالکل احساس نہیں ہوتا حتی کہ ٹرینوں میں بھی ہیٹر لگے ہوتے ہیں۔"

―――――――

ریڈنگ، ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۷ء

"..... مجھے آج انگلستان آئے ایک عشرہ ہو رہا ہے۔ میرے لندن بخیریت پہنچنے اور پھر ریڈنگ میں رہائش پذیر ہونے کی اطلاع آپ کو مل چکی ہوگی۔ پوسٹ گریجویٹ سٹوڈنٹ ہونے کی حیثیت سے خاصی آزادی ہے کلاس ورک کا ساجکڑا بندھا کام نہیں ہے آج ہی صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر ہوجز (PROF. (DR.) HODGES) سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر صاحب کا مزاج اور ذہنی رجحان ان کی دو تین تصانیف لائبریری سے دیکھ کر پہلے معلوم کر لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ میرے ہی بتلائے ہوئے مضامین پر تحقیقی کام کروانے کو تیار ہو گئے ہیں۔ ورنہ عموماً یہاں کی فلسفیانہ فضا سے ہمارا اتفاق مشکل ہوتا ہے۔

میرے کراچی کے ایک پروفیسر صاحب لندن میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ پرسوں ان سے ملنے لندن گیا تھا

وہ بالہم لندن میں مقیم ہیں۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچا۔ زیرِ زمین ٹرین میں یہ میرا پہلا سفر تھا۔ زیرِ زمین بڑے جنکشن دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خود میں نے بالہم پہنچنے کے لئے دو جگہوں سے ٹرین بدلی۔ یہ گاڑیاں بہت تیز اور بے تحاشا تعداد میں چلتی ہیں یعنی انتظار بالکل نہیں کرنا پڑتا۔

پروفیسر اکرام الٰہی صاحب مجھ سے بے تکلف انداز میں ملے بہت سے مفید مشورے دیے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب میرے ایک بزرگ استاذ خود پیاز کاٹتے اور برتن دھوتے ہیں تو میں ایسا کیوں نہیں کرسکتا۔ اب تک صرف انڈے پر کام چلا رہا ہوں۔ بہرحال اب ارادہ کیا ہے کہ کچھ سبزی اور کبھی کبھی گوشت بھی پکاؤں گا۔

ہاسٹل کا کمرہ بہت آرام دہ اور کشادہ ہے۔ پوری عمارت CENTRALLY HEATED ہے اس لئے سردی کا بالکل احساس نہیں ہوتا البتہ باہر نکلتے ہوئے تمام کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ مطلع عموماً ابر آلود رہتا ہے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہوتی رہتی ہے۔ لوگ عموماً چھتریاں یا رین کوٹ استعمال کرتے ہیں۔"

ریڈنگ ۱۵۔ نومبر ۱۹۷۶ء

"……میرا ریسرچ کا موضوع باقاعدہ تو متعین نہیں ہوا ہے البتہ میں نے پروفیسر ہاجز صاحب کو بتا دیا تھا کہ مجھے دلچسپی مابعد الطبیعات اور اخلاقیات سے ہے۔ چنانچہ وہ انہی دو مضامین کے کسی مشترک موضوع پر کام کروائیں گے۔ پروفیسر ہاجز صاحب بڑی عمر کے بزرگ اور شریف الطبع انسان ہیں۔ ایک جدید سوشل مفکر ولیم ڈلتھی پر دو کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل دو کتابوں کے مصنف ہیں:۔

1- LANGUAGES STANDPOINTS & ATTITUDES.
2- THE PATTERN OF ATONEMENT.

مؤخر الذکر کتاب میں نے ابھی سرسری طور پر دیکھی ہے۔ خالص مذہبی کتاب ہے۔ علاوہ ازیں پہلی ہی ملاقات میں ان کا یہ جملہ:۔

"WELL, I AM A CHRISTIAN; I BELIEVE IN GOD!"

ان کے خیالات اور فکر کا آئینہ دار ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ کسی گمراہی کی طرف نہیں لے جائیں گے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہی فضل ہے ورنہ یہاں کے ماحول کے ساتھ ساتھ اگر علمی مربی بھی غلط مکتبِ فکر کے مل جائیں تو پھر بھٹکنے سے شاید ہی کوئی چیز مانع ہوتی ہو۔

ہفتے میں منگل کے روز بعد دوپہر ان سے ملاقات کا وقت طے پایا ہے۔ پہلی میٹنگ کے بعد پروفیسر صاحب نے کانٹ کی کتاب "FUNDAMENTAL PRINCIPLES OF THE META-

(بقیہ صفحہ ۱۴۲ پر)

تقریظ و تنقید

م۔م۔م

قادیانیت

مطالعہ و جائزہ

مصنف:۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
رکن عربی اکادمی، دمشق

شائع کردہ:۔ ادارۂ نشریات اسلام، مسلم مسجد انارکلی۔ لاہور۔

طبع دوم، صفحات ۲۲۸، سائز ۱۸×۲۲/۸، مجلد
مع گرد پوش، طباعت و کتابت عمدہ و دیدہ زیب   قیمت:۔ پانچ روپے

(اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن پر میثاق بابت جنوری ۷۶ء میں مفصل تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر وہ بتمام و کمال درج ذیل ہے!)

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہٗ کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ بلادِ اسلامیہ عربیہ میں تو بےحد مقبول و محبوب ہیں۔ انہوں نے اپنے ہادی و مرشد مولانا عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی خواہش پر قادیانیت کا باضابطہ مطالعہ کیا اور پھر بزبانِ عربی ایک کتاب رقم فرمائی جس کا نام ہے "القادیانی والقادیانیۃ"۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالحسن صاحب کو مرشد مغفور کی طرف سے حکم ملا کہ اس کو اردو میں منتقل کردیا جائے چنانچہ اصل اردو خوانوں کی خاطر سارا متعلقہ مواد دوبارہ دیکھنا ضروری ہوگیا۔ اس "بازدید" کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو ترجمہ اصل عربی سے کسی قدر مختلف اور آزاد صورت اختیار کرگیا۔ زیرِ نظر کتاب اسی اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

اس موضوع پر اردو زبان میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم، الیاس برنی صاحب، ملک محمد جعفر صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کے علاوہ کئی اور اہلِ قلم نے بھی بصیرت افروز کتابیں اور رسائل رقم کئے ہیں اور ہر ایک نے اپنی طرف سے بڑے خلوص کے ساتھ حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس عجیب و غریب تحریک کے خدوخال بڑی حد تک اپنے صحیح روپ میں اہلِ نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس قیمتی ذخیرے میں گرانبہا اضافہ ہے۔ بظاہر مختصر سی کتاب ہے مگر مواد کے انتخاب اور اس کی ترتیب کے اعتبار سے خاصی تسلی بخش

چیز ہے۔ کتاب چار حصوں میں اور پھر ہر حصہ تین تین چار چار ابواب میں منقسم ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں جو بات سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہے وہ اسلوب بیان کی متانت ہے جس پر تحقیق رنگ غالب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے لیے اس تکلیف دہ موضوع پر قلم اٹھاتے وقت جذباتی ہو جانا قدرتی سی بات ہے۔ مولانا نے کہیں بھی حقائق نگاری پر اپنے جذبہ و احساس کو غالب نہیں آنے دیا چنانچہ دیباچے میں انہوں نے ایسے قارئین سے معذرت چاہی ہے جنہیں اپنے جوش و خروش کے مقابل کتاب کا خشک استدلال کوئی زوال سی چیز نظر آئے گا۔

مولانا نے کتاب کے پہلے باب میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر کی اس سیاسی و دینی صورتِ حال پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے جس سے برِعظیم پاک و ہند کے مسلمان دوچار تھے۔ سیاسی بدحالی کے ساتھ معاشی ابتری اور اخلاقی انحطاط کا احساس شدید تھا جس کے نتیجے کے طور پر مسیح موعود کا تصور ایک امید و آرزو کی شکل اختیار کر کے بار بار مضطرب دلوں کو تحریک دیتا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزی حکومت کا رویہ خاصا دل شکن تھا۔ اس حکومت کے زیرِ سایہ مذہبی آزادی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غیر منظم مسلمانوں کے خلاف منظم آریہ سماجیوں اور پادریوں کے نعرۂ جہاد کا رنگ دیکھ چکے تھے اور جذبۂ جہاد کو کچلنے کے درپے تھے — یہ سارے امور مسلم ملت کی پریشانیٔ خاطر کا باعث بنے رہے۔

اس پریشانیٔ منظر کو جمعیتِ خاطر میں بدلنے کے لئے کئی ہمدردانِ قوم سرگرمِ عمل تھے۔ بعض وہ تھے جو قوم کے جذبۂ جہاد کو قائم رکھ کر اسے تحفظ و ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ بعض انگریز کے دل سے مسلمان کی متوقع مخالفت و "نفاق" کا وہم دور کرنے کے درپے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس کوشش میں تھے کہ آریہ سماجیوں اور پادریوں کی زہر افشانی کا سدِباب کریں۔ اس دوسرے گروہ میں سر سید اور ان کے کئی رفقاء شامل تھے۔ اسی گروہ کے مسلک سے ملتا جلتا مرزا غلام احمد قادیانی کا مسلک تھا۔ یہ گروہ جدید علوم کی روشنی میں دینی معاملات کی توجیہہ و تشریح کا ایسا مریض تھا کہ جہاں بھی جدید علم اور دین کے کسی مسئلے میں آویزش ہوتی وہاں فوراً تاویل سے کام لیتا اور دین کو سائنس کے تابع کر دیتا — اس چیز نے دین میں تاویل پسندی کے رجحان کو تقویت بخشی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا غلام احمد جو شروع میں عیسائی پادریوں اور آریہ سماجیوں کے مقابلے میں تاویلوں سے کام لے رہے تھے اور اس طرح مسلم ملت میں دینی حمیت و کثرتِ مطالعہ کے اعتبار سے شہرت پا چکے تھے اس تاویل ہی کے بل بوتے پر رفتہ رفتہ مجدد پھر مسیح موعود اور آخر کامل و سالم نبی بن بیٹھے اور وہ اس طرح کہ ان کے بعد اور کوئی نبی نہ ہوگا گویا خاتم النبیین کے منصب پر خود کو فائز کر دیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے جو مرزا غلام احمد ہی کی تحریروں سے اپنی ہر دلیل کا اثبات کیا ہے۔ انہوں نے وضاحت سے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ اس دور میں انگریز کے لیے اس سے زیادہ خوش آئند اور کوئی بات نہ تھی کہ مسلمان باہم دست و گریباں ہوں اور ان کے مابین عقیدوں کی چپقلش شروع

ہو جائے۔ مرزا غلام احمد کے نئے نئے دعاوی مسلمانوں کی توجہ کو انگریزوں کی جانب سے ہٹا کر قادیان کی طرف منعطف کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں مرزا غلام احمد کا یہ موقف کہ جہاد منسوخ ہو چکا انگریزوں کے لئے مزید خوش کن تھا چنانچہ انگریزی حکومت نے اس پودے کی خوب خوب آبیاری کی۔ فاضل مصنف نے اس نئی تحریک کے سربراہ کی اپنی تحریروں اور ان کے خلیفہ و فرزند کی تحریروں کے اقتباسات سے یہ بات ذہن نشین کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ یہ سلسلہ انگریزوں کا کس قدر مرہون اور ممنون تھا۔

انگریزی استعمار کے زیرِ سایہ پرورش پانے والی جدید باطنی ہر روز پھولی پھلی اور مرزا غلام احمد کی خود پرستی مستی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ مرزا نے نہ صرف اپنے مخالفین کی شان میں گستاخیاں کرنا شروع کر دیں بلکہ بعض اوقات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں حدِ ادب کا خیال نہ کیا۔ اپنے دور کے علماء کو گویا باضابطہ ماؤں بہنوں کی گالیاں زبانِ دہن سے بھی دیں اور زبانِ قلم سے بھی — غیظ و غضب کے انگارے اس طرح بکھیرے کہ لعنت لعنت لعنت لکھتے کئی صفحے سیاہ کر دیئے۔ یہ اس فرد کا اخلاق ہے جو اپنے آپ کو اکثر و بیشتر انبیاء سے برتر جانتا ہے — اس ضمن میں یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ محمدی بیگم سے شادی کے جنون میں غرق ہو کر دعوے کر دیا کہ اگر واقعی میں مرسل من اللہ ہوں تو یہ شادی ہو کر رہے گی — اس دعوے کے بعد محمدی بیگم کے اعزہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ان خطوط کا حوالہ موجود ہے جن کی رُو سے مرزا نے محمدی بیگم کے اعزہ سے رحم کی درخواست بھی کی اور اس خاتون کے والد پر دباؤ ڈالنے کی التجا بھی کی۔ ایک صاحب کو یہاں تک لکھا کہ اگر تم میری شادی کرا دو تو تمہیں اپنی تمام جائیداد کا ایک تہائی حصہ حق الخدمت کے طور پر نذر کر دوں گا۔ ایک محترمہ کی بیٹی عزت بی بی مرزا کی بہو تھیں۔ انہوں نے عزت بی بی کی ماں کو کہا کہ اگر وہ اپنے بھائی احمد بیگ کو (جو محمدی بیگم کے والد تھے) اس کام پر آمادہ نہ کریں گی تو تمہیں طلاق دلا دوں گا۔ محمدی بیگم کے والد صاحب — کی غیرت برقرار رہی اور یہ شادی نہ ہوئی، چنانچہ رسالت کے مدعی نے بیگناہ عزت بی بی کو اپنے بیٹے فضل احمد سے طلاق دلوا دی۔ مرزا کی ڈینگ مارنے کی عادت اس سے قبل بھی تماشا دکھا چکی تھی۔ مولوی ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور کے بارے میں مرزا نے کہا تھا کہ اگر میں سچا ہوں تو مولوی ثناء اللہ عنقریب میری زندگی میں چل بسے گا اور میں جھوٹا ہوں تو میں چل دوں۔ مرزا چل دیئے اور مولوی ثناء اللہ امرتسری ان سے فقط چالیس برس بعد راہیٔ عدم ہوئے۔

مرزا اپنے دعاوی میں جوں جوں پختہ ہوتے گئے ان کی ہوسِ اقتدار میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ جو مجھے زمانے گا یا مجھے جھوٹا کہے یا میرے معاملے میں کشمکش و پیچ میں رہے وہ کافر ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے کوئی احمدی نماز پڑھے نہ ایسے شخص کا کوئی احمدی جنازہ پڑھے — یہ مرزا کا ایک عجیب نفسیاتی

پنچ ہے کہ اپنے آپ کو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بھی کہیں مگر ان کے پروانوں کو کافر قرار دیں اس لئے کہ وہ مرزا کے دعویٰ کو غلط جانتے ہیں گویا تکمیلِ ایمان کی شرط مرزا پر ایمان ہے جس کا مطلب صاف ہے کہ ایمان کا ویٹو VETO مرزا کے پاس ہے ـــــ اس موقف کو گستاخی کی کونسی قسم قرار دیا جائے؟

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے مذکورہ بالا کیفیت کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے اور غنیمت ہے کہ اس مرحلے پر بھی عنانِ قلم کو سنبھالے رکھا ہے۔

مولانا نے لاہوری پارٹی کے موقف پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مولوی محمد علی آنجہانی کا ذہنی تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح ان کا ذوقِ تاویل انہیں کن نئی وادیوں میں لے گیا۔ قادیانی گروہ اپنے مسلک کے ضمن میں صاف گو تو ہے وہ مرزا کو کھلم کھلا نبی مانتا ہے مگر لاہوری گروہ کا سربراہ ذوقِ تاویل میں مرزا کے بالکل صاف اور واضح کلمات دعویٰ کی صورت بھی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ مولوی محمد علی کا یہی رویہ قرآن کریم میں بیان کردہ تقریباً ہر معجزے کے بارے میں ہے۔ عجیب عجیب مضحکہ خیز کوڑیاں دور دور سے لائے ہیں ـــــ بالفاظِ دیگر یہ گروہ وہ ہے جو نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا ہوا۔

آخر میں مولانا نے بڑے تحمل کے ساتھ مگر پر درد الفاظ میں بیان کیا ہے کہ دنیائے اسلام میں اس نئی تحریک کے باعث تشتت پیدا ہو رہا ہے یہ مسلمانوں کی مرکزیت ختم کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔ مکہ اور مدینہ کا وہ مقام جو مسلمانوں کے دل میں ہے ان کے دل میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس تحریک کے سربراہ نے متوازی امت تخلیق کر کے اپنے گمراہ پیروؤں کی نگاہوں میں نئے شعائر کا بیشتر احترام پیدا کر دیا جس کے باعث ملت اجتماعی شعائر کا درجہ ثانوی ہو گیا بلکہ ثانوی بھی نہ رہا۔

سو چونکہ مختصر ہونے کے باوصف یہ کتاب قادیانیت کے نمایاں پہلوؤں پر اچھی خاصی روشنی ڈال دیتی ہے اور اس دور میں کہ وقت کی کمی ایک عام معذرت بن گئی ہے ایسی کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا عدیم الفرصت اہلِ شوق کے لئے یہ کتاب بطور خاص موزوں و مفید ہے۔

دیوانِ فراہیؒ

تیس بتیس صفحات پر مشتمل ننھی سی کتاب جسے دائرہ حمیدیہ نے مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ

(بھارت) سے شائع کیا ہے۔ یہ کتابچہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا عربی دیوان ہے۔ جس میں سولہ نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔ مرتب کا اسم گرامی بدر الدین الاصلاحی ہے۔

میثاق کے پچھلے شمارے میں مولانا فراہیؒ کے دیوان کلام فارسی پر جس کا نام "نوائے پہلوی" ہے تبصرہ کیا گیا تھا۔

آج کے بدلے ہوئے ماحول میں یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے اہل علم فارسی و عربی میں بسہولت تمام شعر کہہ رہے ہوں۔ حق یہ ہے کہ ایشیا کے بیشتر مسلم ممالک میں فارسی کو صدیوں ادبی زبان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ عربی کی حیثیت بنیادی طور پر دینی و علمی زبان کی تھی، تاہم ایشیائی مسلم اقوام میں اس زبان کے شعرا بھی نایاب نہ تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اس برعظیم کے دینی رہنما اور ان کے اہل حلقہ میں ہزاروں افراد عربی قدیم و جدید کے ادبی شاہکاروں کو سمجھنے اور ان پر تنقیدی تبصرہ کرنے اور تحسین و آفریں کہنے کے اہل تھے ـــــ آج عربی اجنبی زبان ہے۔ پچاس برس پہلے تک اپنی تھی، اور مسلم اقوامِ عالم کے لئے رشتۂ گلدستہ کا کام دے رہی تھی۔

مولانا فراہیؒ کا عربی کلام بھی ان کے فارسی کلام کی طرح سلیس و شگفتہ ہے۔ اکثر و بیشتر حصہ چھوٹی اور رواں دواں بحور میں ہے۔ عربی شاعری کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ وہ جذبے کی ترجمان ہوتی ہے۔ تخیل کی آمیزش فارسی شاعری کے مقابلے میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ گویا عرب سیدھی بات کرتے تھے خیالی ایچ پیچ ان کے مزاج کے خلاف تھے۔ یہی کیفیت مولانا فراہی کے اشعار کی ہے۔ عربی شعر کہتے وقت انہوں نے عجمی لب و لہجہ اختیار نہیں کیا۔ ان کے اشعار میں عربی شعرائے متقدمین کا انداز صاف جھلک رہا ہے ایک آدھ مقام پر مصرعوں کے تکرار نے مہلہل کے مرثیہ کلیب کی یاد تازہ کر دی ہے۔

نظموں کا عمومی مزاج اخلاقی و دینی ہے ـــــ ان میں سے ایک تہائی ملی جذبے سے سرشار ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک تین برس بڑی ہلچل کے تھے، ادھر طرابلس میں ترکی کے خلاف اٹلی نے دھاوا بولا، فرانس اور برطانیہ اٹلی کو شہ دیتے رہے، ادھر بلقان میں یونانیوں اور بلغاریوں نے اٹلی کی شہ پر اور دیگر مسیحی اسلام دشمنوں کی حوصلہ افزائی کے باعث ترکوں کی حکومت اور اس علاقے کی مسلم آبادی کو قیامت صغریٰ سے دوچار کر دیا تھا۔ ان واقعات نے برعظیم پاک و ہند کے مسلم اہل دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مولانا فراہیؒ کی یہ نظمیں ملی وحدت کا پیغام بھی ہیں اور ملامت بھی۔ مولانا فراہیؒ کے علاوہ اس برعظیم کے کئی اور مسلم زعماء نے بھی جو شعر کہنے پر قادر تھے، ان واقعات پر اشک افشانی کی ہے اور امت کو دشمنانِ اسلام کے خلاف متحد ہو جانے کی تلقین کی ہے۔ مولانا ظفر علیؒ، ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، مولانا شبلیؒ اسی دستے کے شہسوار ہیں

میں سے تھے ۔۔۔ آج بیت المقدس چھن جانے کے بعد اس حمیت ملی کی روح کو بیدار کرنے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے ۔ اے کاش اہل عرب کو ان کی زبان میں پیغام اسلام باسلوب شعر پہنچایا جا سکتا ۔

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

مولانا فراہی ؒ کا کلام وحدت ملت کا درجہ پڑھنے والوں کیلئے نقیب کا کام دے سکتا ہے ۔

آخر میں نمونۂ کلام کے طور پر مشتے از خروارے کچھ اشعار ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں ، الفاظ کا دروبست صاحب کلام کی وسعت مطالعہ اور قادر الکلامی کا آئینہ دار ہے ، یہ دیکھئے ایک نظم بعنوان ہے "فی التحذیر عن الدنیا"

یا بوس للدنیا شقیا سعیدها   فیا ویل من یسعی لها یستزیدها
فلا یرجعن الا الی الضر نفعها   ولا یرجعن الا الی الشر جودها
فسیان عندی عدمها ووجودها   وسیان عندی وصلها وصدودها

برا ہو اس دنیا کا یہاں کا خوش بخت بھی بدبخت ہے ، کتنا افسوس ہے اس پر جو اس کے بڑھانے کے لیے مصروف تگ و دو ہے ۔ اس کے ہر فائدے کا انجام محض نقصان اور اس کی ہر بخشش کا ثمر محض بخل ہے ۔ لہٰذا میرے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے اور اس کی ملاپ اور اس کی بے رخی یکساں ہے ۔

ذیل کے اشعار "فی غفلة الانسان" سے لیے گئے ہیں ۔

اما للناس احلام   اهم فی السکر نوام
وهم وردا حوض المو   ت اصرام فاصرام
وریب الدهر یبریهم   وتوهی العظم اسقام
فحبل الموت ممدود   وحبل العیش ارمام
وهم باللهو واللذا   ت مشغولون ما داموا
بجمع الوفر منهوموا   ن والآثام هیام
وهم لابد محشورو   ن یوما وهو ایام
عن النعماء مسئولو   ن والسائل علام

کیا لوگ عقل کے اندھے ہیں یا کیا وہ نشہ پی کر سوئے ہوئے ہیں ، حالانکہ وہ حوض مرگ پر گروہ در گروہ وارد ہونے والے ہیں ، گردش زمانہ انہیں نذر غبار کر رہی ہے اور اس کے

دیمک کی طرح کے ضعف عطا کر رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ موت کی رسی دراز ہے ، اور زندگی کی رسی گل چکی ہے ، اس کے باوجود یہ لوگ کھیل کود اور لذت کوشی میں تادم آخر مشغول رہیں گے ۔ وہ دنیاوی متاع اور خزینہ گناہ جمع کرتے نہیں تھکتے ، اس دھن میں ان کی مت ماری گئی ہے ۔ انہیں یاد نہیں کہ انہیں ایک دن قبروں سے نکالا جائے گا وہ دن اپنی شدت کے باعث ، بڑا لمبا ہوگا اس دن ان سے دنیا کی ہر دولت کے بارے میں پوچھا جائے گا اور پوچھنے والا وہ ہوگا جو سب کچھ جانتا ہے ۔

اسی طرح کچھ شعر اس نظم میں سے ملاحظہ کیجیے "فی تطاول الطلیان علی طرابلس" (طرابلس پر اٹلی کا دھاوا)

کیف القرار وقد نکس   اعلامنا بطرابلس
کیف القرار وحولنا   الاعداء ترتقب الخلس
من کل ذئب ان رأی   من غرة فینا اختلس
او نمر ان مطرت   ان لم نبادره نهس
یا امة الاسلام یا   ابناء آباء شمس
الا تهجعوا الیوم فا   لاسلام تیعس بل تعس
قد زلزلت ارکانه   حتی تقعقعت الاسس
هل ترتضون بذل دیـ   ـنکم ولیس بملتبس
والله لا نرضی به   ما دام فینا من نفس

ہم کیونکر بیٹھے رہیں حال یہ ہے کہ طرابلس میں ہمارے جھنڈے جھکا دیئے گئے ہیں ، ہم کب تک بیٹھے رہیں حال یہ ہے کہ دشمن ہمارے گرد در آنے کے لیے گھات میں ہے ۔ ہر بھیڑیا تاک میں ہے کہ ہمیں غافل دیکھے تو چیر پھاڑ ڈالے ۔ ہر سانپ سر نکالے بڑھا چلا آ رہا ہے اور اگر ہم نے اس کے خلاف پہل نہ کی تو ہمیں ڈس کر رہے گا ۔ اے امت اسلام اے آفتاب قدر آبا کے فرزندو کیا آج بھی نہ جاگو گے ، دیکھو اسلام پر برا وقت پڑنے والا ہے بلکہ پڑ ہی چکا ہے ۔ اس کے ستون ہلا دیئے گئے ہیں ۔ اس کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں ۔ کیا تم کسی ذلت کو گوارا کر لوگے ؟ اب یہ معاملہ ڈھکا چھپا نہیں ۔ قسم خدا کی ہم یہ بات اس وقت تک گوارا نہ کریں گے جب تک ہم میں ایک متنفس بھی باقی ہے ۔

(ام ۔ م ۔ م)

ع - د

رسیدِ کتب

انتخاب رباعیات مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

از : نجم الدین اصلاحی ، صفحات : ۷۶ ، قیمت ۲۰ روپے

شائع کردہ : نجم الدین اصلاحی ، سرائمیر ، اعظم گڑھ (یوپی) بھارت

مولانا نجم الدین اصلاحی نے مولانا ابو الکلام آزادؒ کے ایماء پر مولانا رومؒ کی رباعیات بڑی کاوش سے منتخب کی ہیں اور اس کتاب کو مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام معنون کیا ہے۔ اہل علم کے نزدیک ان تمام رباعیات کا انتساب مولانا رومؒ کی طرف محل نظر ہے۔ ان کی رائے میں متعدد رباعیات کا انتساب مشکوک ہے۔ بہر حال یہ کتاب مجموعی طور پر اسرار و حکم کا ایک گراں بہا مجموعہ ہے۔

عزیزانِ ندوہ کے نام

از : پروفیسر رشید احمد صدیقی ، صفحات ۲۴ ، قیمت ڈیڑھ روپیہ

ناشر : جمعیۃ الاصلاح ، دار العلوم ندوۃ العلماء ، لکھنؤ

چار پانچ ماہ قبل دار العلوم ندوۃ العلماء ، لکھنؤ کی "انجمن الاصلاح" نے مشاہیر علم و فن سے دار العلوم کے طلبہ کو مقالات اور تقاریر سے مستفید کرنے کا پروگرام بنایا تھا توسیعی خطبات کا یہ سلسلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے زیر نظر مقالے سے شروع ہوا ہے جسے انھوں نے عزیزانِ ندوہ کے نام سپردِ قلم کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو یہ مقالہ دار العلوم میں منتخب مجمع کے سامنے مولانا عبد الماجد دریابادی کی زیرِ صدارت پڑھا گیا جس میں شہر کے اہلِ ذوق ، تعلیمی اداروں اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ کرام اور طلبہ شریک ہوئے۔ یہی مقالہ افادہ علمی کی غرض سے شائع کیا گیا ہے۔

فہرست مضامین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جولائی ۱۹۶۶ء — تا — دسمبر ۱۹۶۷ء

'میثاق' کا دورِ جدید زیر ادارت ڈاکٹر اسرار احمد و زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی جولائی ۱۹۶۶ء میں شروع ہوا تھا۔ اس طرح نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء کے مشترکہ شمارے کے ساتھ نئے انتظامات کے تحت 'میثاق' نے ڈیڑھ سال مکمل کر لیا ہے ۔۔۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

صفحاتِ آئندہ میں اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو مضامین 'میثاق' میں شائع ہوئے۔ ان کی موضوعات کے اعتبار سے مرتبہ فہرست دی جا رہی ہے تاکہ یہ 'میثاق' کے ڈیڑھ سال کے فائل کے انڈکس کا کام دے سکے۔

مینجر

★ — تجدید میثاق —

- ماہنامہ 'میثاق' کے اغراض و مقاصد (میثاق کے پہلے شمارے کے اداریے سے) مولانا امین احسن اصلاحی جولائی ۱۹۶۶ء

★ — تدبر قرآن — مولانا امین احسن اصلاحی —

- مقدمہ (مکمل) — اکتوبر ۱۹۶۶ء تا فروری ۱۹۶۷ء
- تفسیر سورۂ آل عمران از آیت ۶۵ تا ختم سورہ — جولائی ″ ″ ″ ″
- ″ سورۂ نساء از ابتداء تا آیت ۱۰۴ — مارچ ۱۹۶۷ء تا دسمبر ″

★ مطالعۂ حدیث — مولانا عبدالغفار حسن

- جہاد کی اعلیٰ قسم (دو اقساط) — ستمبر و اکتوبر ٦٦ء و نومبر و دسمبر ٦٧ء

★ افاداتِ فراہیؒ — خالد مسعود

- عقیدۂ شفاعت — جولائی ٦٦ء
- ملکوتِ الٰہی — اگست ٦٦ء
- نفس میں گناہوں کا سرچشمہ — اکتوبر 〃
- مصائب و تکالیف کا سرچشمہ — فروری ٦٧ء
- ملکوتِ الٰہی پر شہادت — مارچ ٦٧ء
- ملکوت اور سنت اللہ — اپریل 〃
- اسالیبِ قرآن (سہ اقساط) — مئی، جون، جولائی و ستمبر اکتوبر ٦٧ء

★ فقہ و تفقہ

- زکوٰۃ کی حقیقت (٥ اقساط) — خالد مسعود — اگست تا دسمبر ٦٦ء
- رویت ہلال کا مسئلہ — 〃 — اپریل ٦٧ء
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب (٢ اقساط) — مولانا ضیاء الدین اصلاحی — جنوری و فروری ٦٧ء
- پردہ اور قرآن مجید — مولوی ممتاز حسین مرحوم — ستمبر و اکتوبر ٦٧ء
- رمضان المبارک اور اس کی خصوصیات — مولانا عبدالغفار حسن — نومبر و دسمبر 〃

★ فلسفہ و تصوف

- فلسفہ میں تاریخی نقطۂ نظر کے احیاء کی ضرورت — الصباح احمدؐ ایم اے (فلسفہ) — جولائی ٦٦ء
- فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر — پروفیسر یوسف سلیم چشتی — نومبر دسمبر 〃
- تصوف کیا ہے؟ — 〃 〃 〃 〃 — جولائی 〃
- اسلامی تصوف — 〃 〃 〃 〃 — اگست 〃

★ طلبہ و تعلیمات

- طلباء کے مسائل اور ان کا حل — اسرار احمدؐ — مارچ 〃
- طلباء سے خطاب — مولانا امین احسن اصلاحی — اپریل 〃

- پاکستان میں ایک غیر سرکاری اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت — حافظ نذر احمدؐ — مئی ٦٧ء

★ ادبیات

- المنفلوطی: ایک صاحب طرز افسانہ نگار اور مصلح ادیب — نعمان محمدؐ ایم اے (عربی) — نومبر دسمبر 〃

★ حقائق و معارف

- حقیقت زندگی — اسرار احمدؐ — جولائی ٦٦ء
- عظمت تخلیق اور ارتقائے انسانی — اظہار احمدؐ قریشی جوہر آباد — ستمبر اکتوبر ٦٧ء
- آخری منزل مراد — 〃 〃 〃 — نومبر دسمبر 〃

★ سیاسیات

- ہنگامۂ عید: ایک لمحۂ فکریہ! — اسرار احمدؐ — فروری ٦٧ء
- تحریک پاکستان کا تاریخی پس منظر اور پاکستان میں موجودہ دینی کشمکش — 〃 — مارچ تا مئی 〃 (تذکرہ و تبصرہ میں)
- مندرجہ بالا مضمون پر ایک تنقیدی خط — ڈاکٹر احمد حسین کمال — مئی ٦٧ء
- علمائے کرام کی خدمت میں — ادارۂ بینات کراچی و ادارۂ الرحیم حیدرآباد — 〃 〃

★ عرب اسرائیل جنگ

- فَفِرُّوا اِلَی اللہِ! — اسرار احمدؐ — جولائی ٦٧ء
- خذلانِ الٰہی اور اس کا علاج — عتیق الرحمان سنبھلی مدیر الفرقان لکھنؤ — نومبر دسمبر 〃

★ یادِ رفتگان

- مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی یاد میں — اسرار احمدؐ — اپریل ٦٧ء

★ دعوتِ دین — اور — احیاءِ اسلام

- دعوتِ دین کے لوازم — مولانا امین احسن اصلاحی — اکتوبر ٦٦ء (تذکرہ و تبصرہ)

• نجات کی راہ سورۃ العصر کی روشنی میں	اسرار احمد	نومبر ۶۶ء (تذکرہ و تبصرہ)
• اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کے کام	〃	جولائی ۶۶ء 〃 〃
• اس خلا کو پر کیجئے (عربی سے ترجمہ)	مولانا ابوالحسن علی ندوی	ستمبر اکتوبر 〃
• سنتِ دعوت کا احیاء	اسرار احمد	نومبر دسمبر 〃 (تذکرہ و تبصرہ)

★ تحریکِ جماعتِ اسلامی

• تحریکِ جماعتِ اسلامی (حصہ اول) پر تبصرے	(i) مصطفیٰ صادق مدیر وفاق لاہور	جولائی ۶۶ء
	(ii) ادارہ اجمل باغ	اکتوبر 〃
	(iii) ابو منظور شیخ احمد	〃 〃
• تحریکِ جماعتِ اسلامی (حصہ اول) پر تبصروں کا جائزہ	(i) لاہور کے چار روزناموں کے تبصروں کا جائزہ	اگست 〃
	(ii) پاکستان کے چار ماہناموں کے تبصروں کا جائزہ	ستمبر 〃
• تحریکِ جماعتِ اسلامی (حصہ دوم) "نفتق غزل" کے عنوان سے جائزہ کمیٹی سے ماچھی گوٹھ تک کے واقعات	اسرار احمد (چار اقساط)	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر ۶۶ء
• جماعتِ اسلامی کے ایک بزرگ کے اعتراضات	چوہدری محمد اکبر (سیالکوٹ)	دسمبر ۶۶ء
• جواب	اسرار احمد	جنوری ۶۷ء

★ تنظیمِ اسلامی

• قرارداد رحیم آباد	—	جولائی ۶۷ء
• توضیح قرارداد	مجلسِ مشاورت	اگست 〃
• اجتماع رحیم یار خان	—	
— • ترمیم شدہ قرارداد مع توضیح		ستمبر اکتوبر 〃
— • تقریر	مولانا امین احسن اصلاحی	〃 〃 〃

— • الوداعی خطاب	مولانا امین احسن اصلاحی	ستمبر اکتوبر ۶۷ء
— • تقریر	مولانا عبدالغفار حسن	نومبر دسمبر 〃

★ افکار و آراء — ف — خطوط و نکات

• عجلت پسندی اور حُبِّ عاجلہ	اسرار احمد	جون ۶۷ء
• "نفتق غزل" کے سلسلے میں ایک وضاحت	〃	〃 〃
• علیگڑھ مرحوم	مولانا عبدالماجد دریا بادی (مدیر صدق جدید لکھنؤ)	نومبر دسمبر ۶۷ء
• ایک نیا اصلاحی ادارہ	〃 〃 〃	〃 〃 〃
• جامعہ ملیہ بھی ہندو گردی کے نرغہ:	مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری مدیر انوار الاسلام بنارس	〃 〃 〃
• تاریخ اسلامی کے دورِ فتن کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر	مولانا امین احسن اصلاحی	〃 〃 〃
• فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اس کی فتنہ سامانی	مولانا عبدالباری ندوی	〃 〃 〃
• بریدِ فرنگ	الصبار احمد (جامعہ ریڈنگ، انگلینڈ)	〃 〃 〃

★ تقریظ و تنقید

• تبصرہ محمودی بر ہفوات مودودی حصہ اول مصنفہ محمود احمد عباسی	خ۔م		اگست ۶۶ء
• 〃 〃 〃 〃 دوم	م۔م		ستمبر اکتوبر ۶۶ء
• QADIANISM	〃 مولانا ابوالحسن ندوی	م۔م۔م	جنوری 〃
• قادیانیت	〃 〃 〃	〃	نومبر دسمبر 〃
• نوائے پہلوی، کلام فارسی	مولانا حمید الدین فراہی	〃 〃	ستمبر اکتوبر 〃
• دیوان فراہی: 〃 عربی	〃 〃 〃	〃 〃	نومبر دسمبر 〃
• مکتوبات سعیدیہ		ی۔س۔ح	مئی ۶۶ء

- تعلیمات مجددیہ مکتوبات کے آئینے میں — ی. س. شیخ — مئی ۱۹۶۷ء
- ماہنامہ البلاغ کراچی — ۶ - ۶ — " "
- THE MONTHLY 'LIGHT OF ISLAM — " — " "
- سیدنا معاویہ پر مصنفہ حکیم محمود احمد ظفر — مولانا امین احسن اصلاحی — ستمبر اکتوبر "

رسید کتب - (۶-۵) اگست تا دسمبر ۱۹۶۷ء

- اسلام کا تعارف (وحید الدین خان)
- شراب نوشی اور اسلام (مفتی محمد یوسف)
- سید کوئی قوم نہیں (مولانا میاں خاں)
- وحدت امت (مفتی محمد شفیع صاحب)
- ذکر اشرف (پروفیسر محمد احمد)
- مودودی اور جمہوریت (حکیم محمود احمد ظفر)
- سہل تجوید و قرارت سیدنا عاصم کوفی (ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی)
- سوانح حضرت فرید الدین گنج شکرؒ (وحید احمد مسعود)
- مولانا محمد احمد نانوتوی (محمد ایوب قادری)
- وارثان انبیاء سے خطاب (مولانا ابو احمد عبداللہ)
- تعلیمات اسلام کا ماضی حال اور مستقبل (مولانا بشیر احمد صدیقی)
- انتخاب رباعیات مولانا روم (نجم الدین اصلاحی)
- عزیزان ندوہ کے نام (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

مندرجہ بالا مضامین پر مشتمل

'میثاق' کے ڈیڑھ سال کے پرچے محدود تعداد میں دفتر 'میثاق' میں موجود ہیں۔ ان کی کل قیمت علیحدہ علیحدہ پرچوں کے حساب سے پونے تیرہ روپے اور سالانہ چندے کے حساب سے ساڑھے دس روپے بنتی ہے۔ جو حضرات یہ مکمل فائل طلب فرمائیں گے انہیں یہ سات روپے میں پیش کی جائے گی۔ اگر مجلد فائل مطلوب ہو تو تین روپے میں عمدہ جلد بھی بندھوا دی جائے گی ـــــ گویا ڈیڑھ سال کے مکمل مجلد فائل کا وی پی دس روپے کی مالیت کا ہوگا ـــــ محصول ڈاک 'میثاق' کے ذمے!

'مینجر میثاق'

ایک شعر

تری رہبری کا یہ فیض ہے قدم اہل شوق کے رک گئے
نہ کوئی جوازِ سفر ملا، نہ کوئی دلیل قیام ہے!

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیام پاکستان کے بعد اس نے کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

• ضخامت ۲۰۰ صفحات • سائز بڑا • طباعت آفسٹ • مجلد مع گردپوش
• قیمت ـ ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ

(بقیہ خطوط و نکات از صفحہ ۱۰۴) "PHYSIC OF ETHICS"

پڑھنے کی ہدایت کی تھی ساتھ ہی ایک مضمون اخلاقیات کے بارے میں لکھنے کے لئے کہا تھا جو میں کل دے گیا تھا۔ کل خاصی گفتگو رہی۔ اس ہفتے کا کام افلاطون کے ایک مکالمہ کا مطالعہ اور اس پر اپنے خیالات کو قلمبند کرنا ہے۔ یہاں پر طلبہ کی بے تحاشا سوسائٹیاں اور کلب ہیں جن کی سرگرمیاں خاصی ارتی رہتی ہیں۔

پاکستانی طلبہ میں سے جو صاحب میرے ساتھ سیلی ہال میں مقیم ہیں خاصے شریف اور قدرے مذہبی قسم کے ہیں ورنہ بالعموم سب حضرات بار و رڈانس کے رسیا ہیں۔ چند روز قبل سیلی ہال کے کامن روم میں ایک عراقی اور ایک ترک صاحب سے ملنا ہوا۔ میں نے یہ جان کر کہ مسلمان ہیں جمعے کی نماز کے انتظام کے بارے میں کہا۔ دونوں نے ہی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شام کے وقت بار میں دونوں حضرات شغل مے کشی میں مصروف تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی رائے میں بیر کے پینے میں کوئی مذہبی ممانعت نہیں۔ سوڈان کے ایک طالبعلم میرے نزدیک ہی رہتے ہیں۔ وہ الحمد للہ نیک آدمی ہیں لیکن ان کا سبجیکٹ بایو کیمسٹری ہے۔ صبح سے نکلے رات گئے واپس آتے ہیں۔

جمعے کی نماز شہر میں پیل سٹریٹ پر تبلیغی جماعت کے کارکنوں کے زیر اہتمام حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ وہیں جاتا ہوں۔ انشاء اللہ کسی جمعرات کو لندن ایسٹ کی مسجد میں ان حضرات کے ساتھ ایک رات گذاروں گا اور جمعہ بھی باقاعدہ ادا کروں گا۔ یہاں پر نماز ایک پاکستانی صاحب کے مکان پر ادا کرتے ہیں۔ چھوٹے سے کمرے میں جتنے افراد ہوتے ہیں ـــ بات نہیں بنتی۔

میں آتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے ترجمے اور مختصر حواشی والا قرآن لے آیا تھا۔ تلاوت قرآن کے ساتھ اس میں سے پارہ عم کی سورتیں بمعہ ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ ان میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ جس کی مجھے یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ آپ کی ہدایت کردہ سکیم پر بھی عمل شروع کر دوں گا یعنی حفظ کردہ حصوں کی یاد اور ان کی نمازوں میں تلاوت۔

داڑھی اگرچہ یہاں پر استہزا کا نشانہ بنتی ہے لیکن انشاء اللہ اس کی محافظت کروں گا۔ علامہ اقبال ؒ اور ڈاکٹر رادھا کرشنن سے متعلق آپ کی سطور میرے لئے از حد قابل قدر ہیں۔ جہاں تک مذہبی تجربے کے عقلی اثبات کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ جدید اذہان اس کے بغیر سننے کو کچھ تیار نہیں ـــ لیکن ساتھ ہی ایک ناچیز کے لئے اس تجربے کا ذاتی تحقق اشد ضروری ہے۔ رادھا کرشنن پر آپ کی نگارشات کا منتظر رہوں گا۔ "تنظیم اسلامی" کا قیام باعث انبساط ہوا۔ اللہ کرے کہ اس اجتماعیت کے ذریعے دین کی ٹھوس اور ہمہ گیر خدمت ہو!"

(ابصار احمد)

استقبال رمضان

(ٹائٹل کے صفحہ ۲ سے آگے)

۴ ـــ رمضان کی سحر خیزی سے فائدہ اٹھا کر تہجد کی عادت پختہ کرنے کی کوشش کیجئے اور خاص طور پر اپنے گھر والوں اور پاس بیٹھنے والوں کو اس کا شوق دلائیے اور اگر حالات مساعد ہوں تو رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کی سعادت بھی حاصل کیجئے۔

۵ ـــ اپنی اخلاقی کمزوریوں پر اس مبارک مہینہ میں غالب آنے کی کوشش کیجئے۔ اپنے نفس کا جائزہ لے کر اندازہ کیجئے کہ کس کمزوری کا طبیعت پر زیادہ غلبہ ہے، اس کے ازالہ کا خاص اہتمام کیجئے۔ اگر اپنی ایک کمزوری کے استیصال پر بھی آپ اس مہینہ میں قادر ہو گئے تو اس سے دوسری بہت سی کمزوریوں کی اصلاح کی راہ کھل جائے گی۔

۶ ـــ روزانہ کچھ وقت اپنے دوسرے بھائیوں کو دین کی باتیں بتانے اور سکھانے پر صرف کیجئے اور خاص طور پر اپنے گرد کے ان لوگوں سے ملنے کے مواقع ضرور پیدا کیجئے جو نماز روزے سے غافل ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کی کوشش سے ان کی غفلت دور کر دے۔

۷ ـــ حسب توفیق خود اللہ کی راہ میں انفاق کیجئے اور اپنے دوسرے ذی استطاعت رفیقوں کو بھی اس کی ترغیب دیجئے۔ اس سے غریبوں کی ہمدردی کا حق بھی ادا ہوگا اور روزے کی برکت میں بھی اضافہ ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رض	سلام اللہ صدیقی جونپوری	۱٫۰۰ روپیہ
حضرت معاویہ بن ابی سفیان رض	" " "	۱٫۳۰ "
تاجدار مدینہ کی شہزادیاں	" " "	۱٫۱۵ "
حضرت عمرو بن العاص	" " "	۲٫۹۰ "
وفات سرور کائنات ص	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۱٫۳۰ "
اہلبیت اور اہلسنت	" " "	۱٫۱۵ "
اسلامی حکومت کے نقش و نگار	مولانا ظفیرالدین مفتاحی	۲٫۰۰ "
تحفۂ کربلا	محمد احمد الہ آبادی	۳٫۰۰ "
مولانا مودودی اور سیدنا عثمان غنی رض	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۲٫۳۰ "

دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور - ۱

محی الدین پبلشر نے باہتمام محمد طفیل مالک نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور-۱ سے شائع کیا۔